UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222290

UNIVERSAL
LIBRARY

222290

OUP—552—7-7-66—10,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸ ۳ Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

افسانے

صفحہ

(۱) تصورات ۵

(۲) قلندر ۵۳

(۳) انجام ۸۳

(۴) عورت کا منتر ۱۰۳

(۵) شاہسوار ۱۴۵

(۶) گواہ ۱۸۵

(۷) سہیلی ۲۰۵

تصوّرات

تصوّرات

"جب تمہیں بھوت پریت کے وجود ہی سے انکار ہے تو پھر تم یہ قصہ سُن کر کیا لوگے"۔ میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے کہ وہم بھی ایک خوفناک مرض ہے۔ لیکن جناب! جو چیز آنکھوں سے دیکھی ہو اُسے وہم کون کہے!"

میرے یقین کرنے یا نہ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" ڈاکٹر نے کہا "میں تو صرف یہ سننا چاہتا ہوں کہ تم نے آخر دیکھا کیا؟ یا زہرہ نے کیا دیکھا۔ یا تمہارے نوکر کو کیا نظر آیا۔ جس سے ایک حسین عورت نے عدم کی راہ لی۔ اور ایک غریب دیوانہ ہوگیا۔ لیکن تم ایسے ڈھیٹ کہ ابھی تک زندہ ہو۔ توبہ ہے تمہاری سخت جانی پر بھی"۔

"میری سخت جانی کی تم داد نہ دو تو کون دے"۔ میں نے جواب

دیا "ایک خوفزدہ عورت کی جان تو تم سے بچائی جا نہ سکی۔ جانے دوسرے کا کیا حشر ہوا ہوگا"

"میں طبیب ہوں" ڈاکٹر نے ہنسکر کہا "مسیحا نہیں"

"معلوم شد بافندگی" میں نے کہا "اب تمہارے خلاف وہ پروپیگنڈا کروں کہ بس ایک بار تو یاد ہی کرو"

"میرے یار!" ڈاکٹر نے ہنسکر کہا "بدنام بھی ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا"

اس جانکاہ واقعہ کے بعد جس نے ایک مدت تک میرے لئے زندگی کو بے کیف بنائے رکھا۔ ڈاکٹر نے جو میرا ایک دیرینہ دوست تھا کئی بار یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اُسے اپنی آپ بیتی سناؤں لیکن میں ہمیشہ ٹال دیتا۔ میرے لیت ولعل کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ کسی کو مشکل ہی سے میری بات کا اعتبار ہوگا۔ اور سننے والے اُسے صرف میرے وہم کی کرشمہ سازی سمجھیں گے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مجھ پر جو گذری تھی یا جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ ایک ایسا تحیر انگیز واقعہ تھا کہ سننے والے کو یقین کرنے میں تامل ضرور ہوتا۔ ہماری زندگی میں بعض اوقات کچھ واقعات اس طرح رونما ہو جاتے ہیں کہ ہمیں سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ میری اور زہرہ کی ملاقات بھی ایک ایسا ہی واقعہ تھا۔

اور جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میری اس مکان پر نگاہ پڑی جہاں پہلی ہی شب میں زندگی کا کھیل ختم ہوگیا۔

سائے ڈھل چکے تھے۔ ہم برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے میرے باورچی نے آج سموسے بنائے تھے۔ گرم گرم سموسوں کی پلیٹ سامنے رکھی تھی۔ ایک گلہری جسے میں نے پال رکھا تھا میز پر بیٹھی تھی میں نے سموسہ کا ایک ٹکڑا اس کو دیا۔ اس نے پہلے اسکو سونگھا۔ پھر انار دانہ نکال کر الگ کر دیا اور مزے مزے سے سموسہ کھانے لگی۔ ڈاکٹر جو اُسے پکڑنے کی کوشش کرتا تو وہ اُچک کر میرے پاس آجاتی۔ اور ڈاکٹر کے دوبارہ کوشش کرنے پر کبھی اِس جیب میں اور کبھی دوسری جیب میں چھپ جاتی۔ پھر آہستہ آہستہ سر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھتی۔

"یہ کہاں سے لی؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "بہت مانوس ہے تم سے۔"

"ایک پیڑ کے نیچے پڑی ہوئی ملی۔" میں نے جواب دیا۔

"پالا کیسے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"روئی کی بتّی بنا کر اس سے میں اسے دودھ پلا دیتا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "پل گئی۔"

"تمہیں کبھی کاٹتی تو نہیں۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔"

"کیا منتر پڑھا اس پر" ڈاکٹر نے ہنسکر کہا۔

"محبت کا منتر" میں نے جواب دیا۔

"اُس روز یہ کہاں تھی؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"کس روز؟" میں نے پوچھا۔

"جب تم اس مکان میں گئے" ڈاکٹر نے کہا۔

"میری جیب میں سوئی تھی" میں نے جواب دیا "ورنہ شاید"

"ورنہ کیا" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"اس پر بھی وہی گذرتی جو دوسروں پر گذری" میں نے جواب دیا۔

"دوسروں پر کیا گذری؟" ڈاکٹر نے چائے کی پیالی منہ سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے ہنسکر کہا۔

"ڈاکٹر! گویا تم اس رات کا واقعہ معلوم کرنا چاہتے ہو لیکن میں تو کہہ چکا کہ تم سُن کر اعتبار نہ کروگے"

"لیکن زہرہ کون تھی؟" ڈاکٹر بولا "پہلے تو تم نے مجھ سے کبھی اس کا ذکر اذکار نہیں کیا"

"زہرہ!" میں نے ایک آہ بھرکر جواب دیا "وہ عورت تھی جس کے ملنے سے ایک مرد کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھتی ہے"

"کب سے جان پہچان تھی؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

گلہری میری جیب سے نکل کر میرے کندھے پر آ بیٹھی اور جھک جھک کر مٹھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے پکڑ کر گود میں بٹھا لیا۔ اور مٹھائی کی ایک ڈلی توڑ کر تھوڑی سی اُسے دیدی۔

ڈاکٹر بولا۔

"چھوڑو بھی اس کمبخت کو۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "کیا کیا اس غریب نے؟"

"میں تم سے زہرہ کا پوچھ رہا ہوں۔" ڈاکٹر بولا۔ "اور تم اس کے چاؤ چونچلوں میں لگے ہو۔"

"ڈاکٹر!" میں نے کہا۔ "مجھے خود نہیں معلوم زہرہ کون تھی"

یہ سُنکر ڈاکٹر نے کچھ اس طرح میری طرف دیکھا کہ مجھے بیساختہ ہنسی آگئی۔ میں نے کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ زہرہ کے حسب و نسب سے تو میں بالکل ناواقف ہوں۔ لیکن اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک عجیب عورت تھی۔ رہا یہ سوال کہ میری اس سے جان پہچان کیسے اور کیونکر ہوئی۔ تو جناب! یہ بھی ایک دلچسپ رومان ہے۔ میں تبدیل آب و ہوا کے لئے ایک صحت افزا مقام کی طرف جا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا اور ریل کا سفر۔ میں انجن کی طرف پیٹھ کئے گاڑی کی کھڑکی سے لگا بیٹھا تھا۔ گاڑی جو پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ اچانک کسی سبک رفتار مسافر کی طرح ہولے ہولے حرکت کرنے

لگی۔ پھر انجن کی سیٹی سنائی دی۔ ایک بار۔ دو بار۔ پھر گاڑی کھڑی ہوگئی۔ اکثر مسافر گردنیں باہر نکال نکال کر دیکھنے لگے میں نے بھی جو پلٹ کر دیکھا تو سب سے پہلے جس چیز پر نگاہ پڑی وہ ایک عورت تھی جو ساتھ کی گاڑی سے سر نکالے جھک جھک کر گاڑی کے عقب کی طرف کچھ پریشان نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ساری کا پلّو ماتھے تک کھینچ لیا اور ذرا حجاب آمیز آواز میں کہا۔

"میری انگوٹھی گر گئی ہے"

"آپ کی انگوٹھی"۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر کو لپک کر پوچھا "کہاں؟"

"یہ ابھی ابھی"۔ اس نے جواب دیا "یہیں کہیں گری ہے"

میں گاڑی سے اُترا۔ تو وہ بولی۔

"نہیں نہیں! آپ بیٹھ جائیے۔ کہیں گاڑی نہ چل پڑے"

پیچھے سے گارڈ آرہا تھا۔ میں نے انگریزی میں اس سے پوچھا کہ گاڑی کیوں رُک گئی۔؟

اُس نے جواب دیا کہ پل بن رہا ہے میں نے اس سے انگوٹھی کے گرنے کا ذکر کرکے پوچھا کہ اگر کچھ وقت ہو تو میں تلاش کر لوں۔ "تلاش کر لو میں انتظار کروں گا" کہتا ہوا وہ انجن کی طرف چلا گیا۔ اور میں پٹری کے ساتھ ساتھ انگوٹھی تلاش کرنے لگا۔ خوش قسمتی سے کوئی پانچ دس قدم پر ہی انگوٹھی مل گئی۔ سونے کی تھی۔ اُسوقت انجن نے سیٹی دی۔ اور گارڈ نے سبز جھنڈی

ہلائی۔ گاڑی حرکت میں آئی اور میں بھاگ کر سوار ہو گیا۔ گارڈ نے پاس سے گذرتے ہوئے پوچھا۔

"گاٹ اِٹ!" "مل گیا کیا؟"

"یس! تھینک یو" (ہاں شکریہ) میں نے جواب دیا۔

اپنی جگہ پر اطمینان سے بیٹھ کر جو انگوٹھی والی کی طرف دیکھا تو وہ نظر نہ آئی۔ انگوٹھی میرے ہاتھ میں تھی۔ سُرخ اور سبز نگینے جڑے ہوئے تھے۔ میری سب سے چھوٹی انگلی میں پوری آگئی۔ میں کھڑکی سے لگا بیٹھا تھا۔ اور گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی تھی اور باہر کی ہر چیز اس کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد گاڑی کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔ پھر سگنل آیا۔ رفتار اور بھی دھیمی ہو گئی آخر گاڑی ایک سٹیشن پر رُکی۔ کچھ بے رونق سا اسٹیشن تھا۔ پلیٹ فارم پر دو چار لمپ جل رہے تھے۔ انجن کو یہاں پانی لینا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر نیچے اُترا اور ساتھ والے خانے کی طرف گیا۔ انگوٹھی والی اپنے خانے کی چوبی دیوار سے پیٹھ لگائے کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔

میں نے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر کہا۔

"یہ لیجئے انگوٹھی!"

"انگوٹھی!" اس نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھ کر کہا "اوہو! میں تو بھول ہی گئی۔ بہت تکلیف فرمائی آپ نے۔"

"یہ لیجیے!" میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

اُس نے میرے ہاتھ سے انگوٹھی لے لی اور ساتھ ہی مسکرا کر کہا۔

"آپ باہر کیوں کھڑے ہیں اندر آجائیے۔ میں تو اکیلی بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی آج تو۔"

اس پر ڈاکٹر جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا ہنسکر بولا۔

"اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ تم تو کھڑکی سے ہی اندر کود گئے ہو گے اچھا پھر؟"

"پھر تمہاری ایسی تیسی۔" میں نے جواب دیا۔ "چلو ہٹو! اب آگے نہیں سناؤں گا تمہیں۔"

"اچھا بھئی! ڈاکٹر نے ہنسکر کہا۔" بھول ہو گئی معاف کر دو لیکن بہت آزاد منش عورت ہو گی۔ لیکن تم سے یہ کہکر کہ انگوٹھی گر گئی ہے چھپ کیوں رہی۔ شاید....."

اتنا کہکر ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر سر جھکا لیا۔

"چپ کیوں ہو گئے۔" میں نے کہا۔ "بکے جاؤ اب۔"

"نہیں! نہیں!" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "اب نہیں بولوں گا۔"

میں نے کہا۔

"میں دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھا۔"

"اُسی سیٹ پر جس پر وہ بیٹھی تھی۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کچھ گھونگھٹ

وُونگٹ تو نکال لیا ہوگا۔ یا ایسے ہی بیٹھی رہی۔ تم نے ..... " (ذرا پھر مسکرا کر) "بھئی! یہ بات ہی کچھ ایسی دلچسپ ہے کہ دل میں نتیجہ جلدی معلوم کرنیکا شوق بے اختیار پیدا ہوجاتا ہے۔ اچھا معاف کردو۔ اب نہیں بولوں گا بیچ میں۔" میں نے کہا

"احمق! نتیجہ تو تمہیں معلوم ہی ہے پھر اس کے معلوم کرنے کا شوق کیسا؟"

"نتیجہ!" ڈاکٹر نے ذرا تعجب سے پوچھا "مجھے معلوم ہے۔ وہ کیسے؟"

"وہ غریب مرگئی۔ اور تم نے اُسے مارا" میں نے جواب دیا "یہی نتیجہ ہے اور کیا۔"

"استغفراللہ!" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا "اب لگواؤ مجھے بھی پھانسی۔ شاباش!"

"ڈاکٹر!" میں نے کہا "سُن لو! اب اگر تم نے مجھے ٹوکا تو حشر تک یہ واقعہ نہ سُناؤں گا۔ سُن لیا۔"

"ہاں! سُن تو لیا" ڈاکٹر نے ہنسکر کہا "لیکن حشر کے روز تو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ یہ فرسودہ باتیں کہنے سُننے کا کہاں موقع ملیگا۔"

"فرسودہ باتیں" میں نے کہا "پھر سُننے پر اتنا اصرار کیوں؟"

"محض اس لئے کہ ذرا وقت کٹ جائیگا۔" ڈاکٹر نے جواب دیا "خیر اب نہ ٹوکوں گا۔ اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

میں نے کہا

"کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں یعنی کہاں سے آرہے ہو کہاں جاؤ گے وغیرہ وغیرہ۔ اتنے میں گاڑی کو ایک ہچکولا سا لگا۔ یہ انجن کے گاڑی سے لگنے کی علامت تھی۔ میں جو اپنے خانے میں جانے کو اٹھا تو اُس نے ہنسکر کہا۔

"آپ کا سفر ختم ہونے میں تو صرف دو ہی اسٹیشن باقی ہیں۔ یہیں تشریف رکھئے۔ کچھ باتیں ہی کریں گے"

میں پھر بیٹھ گیا۔

میں نے ہر چند چاہا کہ یہ معلوم کروں کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔ اور کون ہے لیکن میں اس وقت اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نام تو اپنا اس نے زہرہ بتلا دیا۔ اور اس کی باتوں سے میں نے یہ بھی جان لیا کہ کوئی آزاد منش عورت ہے۔ اور تم ایسے بے خبر آدمی کو میں یہ بھی بتلا دیتا ہوں کہ زہرہ بلا کی حسین عورت تھی۔ کوئی بائیس تیئیس کے لگ بھگ ہوگی۔ لباس بھی امیرانہ اور گفتگو میں بھی ایک خاص قسم کا وقار۔ ایک ہلکا تبسم ہر وقت اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر رقص کرتا تھا۔ بجلی کی روشنی میں کانوں کے آویزے اور گلے کا ہار ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ اچانک اس نے گفتگو کا انداز بدلا اور ہنسکر کہنے لگی

"نہ میرے ہاتھ سے انگوٹھی گرتی۔ نہ آج آپ سے ملاقات ہوتی"

"غنیمت ہے آپ کی انگوٹھی تو مل گئی"۔ میں نے کہا۔ "ورنہ اور بھی پریشانی ہوتی"۔

"انگوٹھی آپ کو پسند ہے"۔ اُس نے مُسکرا کر پوچھا۔

"ڈیزائن بہت اچھا ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"مجھے تو اپنے ہاتھ میں کچھ ایسی خوبصورت نہیں معلوم ہوتی"۔ اُس نے اُنگلی سے انگوٹھی اُتارتے ہوئے کہا۔ "ذرا اپنا ہاتھ لائیے اِدھر"۔

"کیوں؟" میں نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

زہرہ نے انگوٹھی میری انگلی میں ڈال دی اور مسکرا کر بولی۔

"واقعی! آپ کے ہاتھ میں خوب سجتی ہے"۔

لیکن جب میں انگوٹھی واپس دینے کے لئے اُتارنے لگا تو وہ بولی۔

"نہیں! نہیں! اُتاریئے نہیں!"

"کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"آپ کے ہاتھ میں خوب سجتی ہے"۔ زہرہ نے مسکرا کر جواب دیا "مت اُتاریئے!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا

"یہ بھی کسی کا تحفہ ہی ہے"۔ اُس نے ذرا پلکیں جھپکا کر کہا۔

یہ الفاظ سُن کر میں ذرا چونک سا گیا۔ اور زہرہ بھی تاڑ گئی۔ ہنس کر بولی۔

"قسمت پر کسی کا زور نہیں۔ بہرکیف آپ کے بہت سے سوالوں کا جواب تو آپ کو مل گیا۔"

پھر میری طرف دیکھکر

"میری خاموشی کا مطلب تو اب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔"

لیکن میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ہنسکر کہنے لگی

"جہاں مرد حجاب کرے وہاں عورت ضرور بے حجاب ہوتی ہے اور جہاں عورت حجاب کرے وہاں مرد کی بیتابیاں اُسے خاموش نہیں بیٹھنے دیتیں۔ ٹھیک ہے نا!"

"جو کچھ آپ سمجھیں" میں نے جواب دیا۔ "میں کیا عرض کروں۔"

"میں جو کچھ سمجھ رہی ہوں" وہ بولی۔ "وقت پر آپ کو بھی معلوم ہو جائیگا رہا آپ کا عرض کرنا۔ تو جناب! معاف فرمایئے! آپ کی یہ خاموشی مجھے آنے والے طوفان کا پتہ دے رہی ہے۔"

میں نے کہا

"دشت و جبل کو طوفان کا کیا خوف؟"

"دُرست!" وہ بولی۔ "لیکن وہ کوہکن ہی کیا جو دشت و جبل میں سے جوئے شیر نہ نکال سکے۔"

"لیکن نتیجہ؟" میں نے کہا۔ "وہی تیشۂ فرہاد یا کچھ اور بھی۔"

"وہ فرہاد کی قسمت تھی اور شیریں کا نصیب۔" زہرہ نے ذرا آنکھیں

مسکا کر جواب دیا "یہاں اب زہرہ ہے اور اس کا ہمسفر!"

میں نے جواب دیا

"جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اسکا ہم سفر ہے کون ؟"

"جن یا پری ؟" زہرہ نے ہنسکر کہا۔

"معمّہ!" میں نے جواب دیا۔

وہ ہنسکر بولی۔

"لیکن آپ نے تو وہ منتر پڑھے ہیں کہ یہ معمّہ خود حل ہوا جارہا ہے۔"

"منتر!" میں نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔ "وہ کب ؟ کیسے منتر ؟"

زہرہ ہنسکر بولی۔

"جب آنکھیں ہی سب کچھ کہہ رہی ہوں وہاں کسی کو زبان کھولنے کی کیا ضرورت ہے ؟"

میں نے سر جھکا لیا۔ وہ پھر کہنے لگی۔

"جناب سوچ میں کیوں پڑ گئے۔ غالباً آپ میری بے باکی اور بے حجابی پر حیران ہو رہے ہوں گے لیکن اب تو آپ کے گاڑی بدلنے کا اسٹیشن آنے والا ہے۔ اس لئے میں کچھ زیادہ عرض نہیں کر سکتی۔ اتنا وعدہ کیجئے کہ آپ میرے خط کا جواب دیا کریں گے۔"

میں نے ہنسکر کہا۔

"مجھے عملیات پر تو دسترس نہیں جو خط لکھ کر کسی مؤکّل کے ذریعہ آپ

تک پہنچا دوں۔"

وہ ہنسکر بولی۔

"آپ عامل نہ سہی لیکن آپ کا دل اتنا بڑا عامل ہے کہ اس کی کشش سے خط کی بجائے زہرہ کبھی خود ہی حاضر ہو جایا کرے گی۔"

"شکریہ!" میں نے کہا۔ "دنیا باُمید قائم ست! خدا وہ دن بھی کرے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔

"شکر ہے! کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ بہرکیف ہوٹل کا پتہ تو آپ کا پکا ہی ہے۔"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔

گاڑی سگنل سے گذر چکی تھی۔ جب اسٹیشن نزدیک آیا تو میں اُترنے کے لیے اُٹھا۔

"بس تشریف لے چلے۔" زہرہ نے بھی اُٹھتے ہوئے کہا

"مجھے یہاں گاڑی جو بدلنی ہے۔" میں نے دروازے کی ہتھی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اچانک زہرہ نے سوئچ بند کر کے خانے میں اندھیرا کر دیا۔ اور میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

اب اگر تم سچ پوچھو تو اس وقت زہرہ کی یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی۔ دو ایک منٹ بعد اسٹیشن آگیا لیکن رخصت کے وقت میں کچھ پریشان سا تھا۔ اور زہرہ صورت تصویر خاموش۔

ڈاکٹر ہنسکر بولا۔

"بہت احمق ہو تم۔ یہ خاموش رہنے کا کون سا موقع تھا اسوقت تو تمہیں اونچے اونچے رونا چاہیئے تھا۔"

"ڈاکٹر!" میں نے بھی ہنسکر کہا۔ "سچ پوچھو تو بعض اوقات تو تمہاری شکل دیکھ کر اور اکثر تمہاری عقل پر مجھے واقعی رونا ہی جاتا ہے۔"

ڈاکٹر ایک آہ بھر کر بولا ؎

ہائے کیسے نصیب ہیں تیرے
روتے آئے ہو روتے جاؤ گے

کم بخت نے یہ شعر کچھ اس طرز سے پڑھا کہ مجھے ہنسی آگئی۔ ڈاکٹر بھی ہنسنے لگا۔

"اچھا" اُس نے پوچھا۔ "تم پریشان تھے اور وہ خاموش تھی یعنی تم اپنی حرکت پر نادم وہ اپنی حرکت پر شرمسار! لیکن اس میں نادم اور پریشان ہونے کی تو کوئی بات نہ تھی۔ سُنا نہیں تم نے کہ "عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود۔" اگر معشوق نے اپنے محبوب کو مٹی کا بُت سمجھ کر اس میں جان ڈالنے کی کوشش کی تو یہ کوئی عیب کی بات نہ تھی۔ خیر یہ تو ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے اس پر پھر کسی وقت بحث کریں گے۔ تو پھر کیا ہوا جب تک اس کی گاڑی نہ چلی تم کھڑکی پر ہاتھ رکھے وہیں کھڑے رہے۔ اور وہ بار بار اپنا ریشمی رومال اپنی آنکھوں پر رکھتی رہی۔ اور جب تک تمہاری گاڑی نہ چھوٹ لی زہرہ کھڑکی سے باہر سر نکالے متواتر تمہیں

دیکھا کی۔ اور تم رومال سے ناک کی رینٹھ صاف کر کر کے جدائی کے صدمے کا اظہار کرتے رہے۔ ایسے موقع پر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہوا کیا ؟"

"بک چکے" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہنسکر بولا۔

"خدا کی قسم! مجھے تمہاری عقل پر ہنسی آتی ہے۔ تم اس کی داد تو دو کہ میں نے ایک نہایت باریک اور ادق فلسفیانہ مسئلہ کس سادگی سے حل کر دیا ہے۔ تم زہرہ کا ذکر کر رہے تھے۔ تمہارے چہرے سے حزن و ملال مترشح تھا میں نے کیا بُرا کیا۔ جو تمہاری توجہ اس طرف سے ہٹا دی۔ لو اب بتاؤ پھر کیا ہوا؟

"خوب!" میں نے کہا۔ "گویا تم جسمانی امراض کے ڈاکٹر ہونے کے علاوہ اب روحانی علاج بھی کرنے لگے۔ خدا ہی ہے جو اپنے بندوں کو تمہاری مشق ستم سے محفوظ رکھے

ڈاکٹر خوب ہنسا۔

میں نے کہا" اب تم خدا کے لئے یہ بار بار دخل در معقولات بند دو بات تو دو منٹ میں ختم ہو جاتی لیکن تمہاری بیہودہ بک بک جھک جھک نے دیکھو کتنا وقت ضائع کر دیا۔"

"پھر غلط کہا تم نے" ڈاکٹر میز پر ہاتھ مار کر بولا" میں نے ....."

لیکن میں نے بات کاٹ کر کہا

"چلو! میں نے ہی جھک ماری جو یہ قصہ تم سے کہنے لے بیٹھا۔ اب سنو گے یا یوں ہی بکے جاؤ گے۔"

"اچھا اب نہیں بولوں گا۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "تم خود ہی تو کہا کرتے ہو کہ ع اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی!

میں اُٹھ کر کمرے میں چلا آیا اور ریڈیو کھولا۔ اس وقت لاہور ریڈیو اسٹیشن سے پنجاب کی مشہور مغنیہ بدر بائی استاد داغ کی غزل ؎

تجھے نامہ بر قسم ہے یونہی دن سہ رات کرنا
کوئی ایک بات پوچھے تو ہزار بات کرنا

بڑے دلفریب انداز سے گا رہی تھی۔ کمرے کی فضا اس کے موسیقی نواز نغموں سے معمور ہو رہی تھی۔ ایک تو حضرت داغ کا رنگین کلام اس پر بدر بائی کی دلوں کو برمانی ہوئی پرسوز آواز۔ طبیعت کچھ کھو سی گئی۔ ڈاکٹر بھی چپکے سے اندر آ بیٹھا۔ جب گانا ہو چکا تو کہنے لگا۔

"گانا بھی عجیب فن ہے۔"

"اس میں شک ہی کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "لیکن مینڈکی کو کب سے زکام ہوا؟"

"جو خود کو رذوق ہو۔" ڈاکٹر نے ہنسکر کہا۔ "وہ دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتا ہے۔"

میں نے کہا۔

حضرت داغ اگر نامہ بر کی بجائے ڈاکٹر کہدیتے تو خوب لطف رہتا۔"

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ پھر ذرا بجاجت آمیز لہجہ میں بولا۔

"لو بھائی! اب بات ختم کرو۔ واقعی بہت وقت ضائع ہوگیا۔"

میں نے ہنسکر کہا

"سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے!"

تو خیر سنو! یہ کھیل تو ریل گاڑی میں شروع ہو کر اسٹیشن پر ختم ہوگیا۔ اب باقی قصہ یوں ہے کہ میں ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ دن گھوما گھامی میں کٹ جاتا کبھی ندی پر جا بیٹھتا اور ندی کی خاموش رفتاریوں میں دل کے سکوت کا درمان ڈھونڈتا۔ کبھی کسی شوریدہ سر چشمے کی شورشوں میں اپنے تفکرات کو بھول جانے کی کوشش کرتا۔ کبھی چاندنی میں کسی پتھریلے ٹیلے پر بیٹھکر کائنات کے سکوت میں دل کا سکوت تلاش کرتا۔ کبھی بازار کا چکر لگاتا۔ اور اس دنیا رنگ و بو کی دلآویزیوں اور عبرت خیزیوں سے سبق اخذ کرنے کی کوشش کرتا۔ اور جب تھک ہار کر ہوٹل میں آ بیٹھتا تو حکیم مشرق علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے منظوم الہام سے تسکین قلب کا کام لیتا۔

ہاں! کبھی زہرہ کی انگوٹھی پر جو نظر پڑتی تو امید کی ایک ہلکی سی جھلک دل کی تاریکیوں میں کچھ اجالا سا کر دیتی۔ لیکن ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے کی

طرح یہ خیال بھی ادھر سے آتا اور ادھر نکل جاتا۔ جانے زہرہ کون تھی؟ عورت کی طبیعت تو سیماب کی طرح ہوتی ہے کبھی جھلک دکھا کر کسی کے نہاں خانۂ دل میں روشنی کی کرن پیدا کر دی۔ اور کبھی بے اعتنائی سے دلِ سنگ گراں گرا دیا۔

ایک روز میں باہر سے آکر پلنگ پر لیٹ گیا "بال جبریل" سرہانے رکھی تھی۔ اٹھا کر جو کھولا تو سب سے پہلے یہ شعر نکلا۔ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ساتھ ہی دروازہ کھلا اور ہوٹل کا بیرا طشتری میں ایک خط رکھے اندر آیا میں نے خط لے لیا۔ بیرا واپس چلا گیا چھوٹے سائز کا لفافہ تھا۔ جسے عام طور پر عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ نام پتہ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ خط میں ایک خاص دلکشی تھی۔ مہر دیکھی لیکن پڑھی نہ گئی۔ میری عمر میں اس قسم کا یہ پہلا خط تھا خیر کھولا! جب خط باہر نکالا تو گلابی رنگ کا سفوف سا بھی گرا۔ بہت خوشبودار سفوف تھا۔ خط کھولا تو سب سے پہلے وہی شعر نظر پڑا۔ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

"زہرہ کا خط تھا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ہاں زہرہ کا!" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے پاس ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "ہے تو سہی کہیں۔"

"بھئی دکھاؤ ذرا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "زہرہ کا خط بھی تو دیکھنے ہی کے قابل ہوگا۔ لاؤ کہاں ہے خط؟"

"کچھ یاد نہیں۔" میں نے کہا۔ "کہاں رکھا ہے۔ پھر کبھی دیکھ لیجو!"

"اٹھو بھی میرے یار!" ڈاکٹر نے کہا۔ "کبھی کسی کی بات مان بھی لیا کرو۔"

میں نے ڈاکٹر کے اصرار پر الماری کھولی۔ اور خطوں کا ایک چھوٹا سا بنڈل نکالا۔

ڈاکٹر نے پوچھا۔

"یہ سبھی زہرہ ہی کے خط ہیں؟"

"ہاں!" میں نے اس بنڈل میں سے ایک خط نکال کر کہا

"یہ ہے وہ خط؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ہاں یہی!" میں نے لفافے کے اندر سے خط نکالتے ہوئے کہا۔

"پڑھو تو!" ڈاکٹر نے کہا۔ "کیا لکھا ہے؟"

"سنو"

"پیارے ہم سفر!

سلام و نیاز!

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

لیکن آپ تو اس روز پہلے ہی امتحان میں گھبرا گئے۔ بندی اندھیرے میں ہی تاڑ گئی تھی کہ میری یہ حرکت آپ کو پسند نہیں آئی۔ لیکن محبت تو اندھی ہوتی ہے! اجی توبہ ہے! یہ میں نے کیا لکھ دیا محبت ایک پاکباز سے مجھے! ع

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھ

لیکن یہ تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

میں کون ہوں اور کیا ہوں؟ یہ سوال آپ کے دل میں کھٹکتا تو ضرور ہوگا۔ لیکن "یہ بھی کسی کا تحفہ ہے" یاد ہیں میرے وہ الفاظ آپکو جو میں نے انگوٹھی کے متعلق آپ سے کہے تھے۔ فرمایئے! اب تو میں معمہ نہیں۔ خیر مزید اطمینان کے لئے اتنا اور بھی عرض کئے دیتی ہوں کہ میں ایک راہ گم کردہ عورت ہوں۔ اور اب ..... اور اب۔ جانے! آپ دل میں کیا کہیں گے لیکن نہیں آپ سے حجاب کیسا؟ کہے دیتی ہوں۔ اور اب ایک جنس ناپاک ہوں۔ ہوگئی نا اب تو آپ کی تسلی۔ شکر ہے یہ قصہ بھی ختم ہوا۔ اور اتنا بھی محض اس لئے لکھ دیا ہے کہ ؎

خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے

تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

کیوں جناب! اب تو معاملہ بالکل ہی صاف ہوگیا۔ خیر چھوڑیئے اس بحث کو

گاڑی کا سفر۔ نہ جان نہ پہچان۔ پُل کی مرمت کے باعث گاڑی کا رکنا۔ میری انگوٹھی کا اتفاقاً گرنا۔ اور آپ کو دیکھ کر میرا کہنا کہ میری انگوٹھی گر گئی ہے۔ اور آپ کا انگوٹھی لیکر آنا۔ یہ تو تھی تمہید۔ اور پھر وہ پُرلطف گفتگو۔ اور خدا کی قسم! آپ کی سادہ پرکاریوں نے وہ جادو جگائے کہ بس ع

دل تیرِ نظر کا نشانہ ہوا!

منزل پر پہنچکر میں نے ان واقعات پر خوب غور کیا۔ ہر پہلو سے سوچا۔ پہلے انھیں امیدوں کی خوشنما روشنی میں دیکھا۔ پھر ناامیدی کی چادر تان کر ہر بات کا جائزہ لیا اور آخر دل نے یہی صلاح دی کہ زہرہ ؎

کوئے نیازِ عشق میں آ جو پڑا ہے نصیب

خاک پہ رکھ جبینِ شوق سجدۂ عاجزانہ کر

توجناب! اب آپ کی چوکھٹ ہوگی اور اس گنہگار کی جبین لیکن کیوں؟ اس تغیر کی کوئی وجہ بھی۔ اس کے لئے وقت کا انتظار کیجئے۔ اور مجھے فی الحال یہ کہہ کر رخصت کی اجازت دیجئے

کہ ؎

صدقے تیری محبت کے کیا داغ محبت ہاتھ آئے
باغ میں ایسے گل بوٹے نہ فلک ایسی تاری ہیں

جانے! اس نوائے سوختہ کا آپ کچھ مطلب بھی سمجھے۔

آپ کی ہم سفر
"زہرہ"

"سُن لیا!" میں نے ڈاکٹر سے جو صوفے پر پیٹھ لگائے سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا پوچھا۔

"ہاں سُن لیا!" ڈاکٹر نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "واقعی تمہارا کہنا ٹھیک ہے کہ زہرہ بڑی ہی عجیب عورت تھی۔ اشاروں اشاروں میں اُس نے سب ہی کچھ تو کہہ دیا ہے۔ الفاظ کی سادگی اور برجستہ اشعار نے خوب لُطف پیدا کر دیا ہے۔ تم نے بھی تو جواب دیا ہی ہوگا؟"

"ہاں!" میں نے کہا۔ "دیا تھا لیکن مجھے اس خط میں عیاری کی بُو آتی تھی۔ عورت خواہ کسی طبقے کی ہو لیکن اتنی بیباکی کچھ غیر فطری سی چیز معلوم ہوتی تھی۔"

"گویا!" ڈاکٹر بولا "تم نے حسب عادت اُس غریب کا جلے کٹے الفاظ لکھ کر خوب ہی جی جلایا ہوگا۔ شاباش میرے شیر!"

"نہیں!" میں نے کہا۔ "نہ تو میں نے جلے کٹے الفاظ ہی لکھے نہ جی

ہی جلایا۔ ہاں میری تحریر سے میرے شکوک اُس پر ضرور عیاں ہو گئے تھے۔"

"یہ تم نے کیسے جانا" ڈاکٹر نے پوچھا۔

اُس کے جواب میں میں نے انہی خطوں میں سے ایک اور خط نکالا۔ اور کہا لو سنو۔

پیارے ہم سفر!

بندی کا سلامِ شوق قبول ہو۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

وہی اشک ہے حقیقی وہی لفظ ہے حقیقی!
کہ جو گر پڑے نظر سے جو نکل گئے زباں سے

عنایت نامہ کا شکریہ! آپ نے استعاروں میں ہی دل کی بات کہدی۔ الحمدللہ! بندی کا خیال غلط نکلا اور آپ تہہ کو پہنچ گئے یعنی! ان دلفریب چہروں کے پردے میں بعض اوقات ہولناک سیاہ کاریاں بھی چھپی ہوتی ہیں" لیکن انسان تو جرم وخطا کا پتلا ہے۔ اگر کوئی بھول کرنے کے بعد معافی کا خواستگار ہو تو کیا آپ معاف نہ کریں گے۔ بیشک اب میری یہی آرزو ہے کہ ؎

چمک اے حقیقتِ دلستاں مجھے تازہ سانچے میں ڈھال دے
میں وہ شمع ہوں جو پگھل چکی ہو تمام بزم مجاز میں

لیکن معلوم ہے آپ کو کہ اب وہ حقیقت دلستاں کون سی چیز ہے۔ وہ میرا ہمسفر ہے۔ جس کی سادگی نے۔ یا جس کی سادہ پرکاری نے جیسے کہ میں پہلے خط میں لکھ چکی ہوں۔ میرے نہاں خانۂ دل میں اچانک ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ مجھے پھر یہ توقع ہونے لگی ہے کہ شاید میں بھی کسی وزسید بھی راہ پر آسکوں گی۔ کیونکہ ے

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اُبھر آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

ہاں جناب! باسی چیز سے بسا اوقات گھن بھی آنے لگتی ہے لیکن محبوب کے گلے کے باسی پھولوں سے تو محبوب ہی کی بُو باس آتی ہے۔ لیکن کیسے؟ اس کا جواب میں کیا عرض کروں بس اپنے ہی دل سے پوچھ لیجیے۔ معذوری اور مجبوری کا طعن مت دیجیے۔ میں آزاد بھی ہوں اور پابند بھی۔ لیکن میری آزادی بھی عارضی اور پابندی میں عارضی واقعات انسان کو مجبور کر دیتے ہیں لیکن اب تو کچھ دنوں سے یہ حالت ہے کہ ے

ہجر میں اپنا اور ہی عالم ابر بہاراں دیدۂ پُر نم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں اُف رے جوانی ہائے زمانے

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ کبھی بلائیں گے بھی؟

انسان اور خصوصیت سے ایک عورت کے دل میں بعض اوقات ایک ایسا تغیر پیدا ہو جاتا ہے کہ دیکھنے سننے والے حیران رہ جاتے ہیں اور اُن ہی میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ لکڑی میں لچک ہو تو کمان کی طرح جتنا چاہو جھکا لو۔ لوٹے گی نہیں۔ اسی طرح دل میں اگر کسی چیز کی تڑپ ہو تو حصول مدعا کے راستے خود ہی کھلتے نظر آنے لگتے ہیں۔

میں آپ کی باتوں سے ہی پا گئی تھی۔ کہ آپ کا دل سکون کا جویا ہے۔ آپ کی نگاہیں آپ کے دل کی کیفیت کی ترجمان تھیں۔ میں نے یہ کہکر کہ آپ اندر آ جائیے۔ میں اکیلی ہی ہوں ایک پانسہ پھینکا تھا۔ اور میں خوش ہوں (آپ شاید ناراض ہوں۔) کہ جیت میری ہی ہوئی۔

مجھے آپ کی ضرورت ہے اور آپ کو میری۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قسمت کو کیا منظور ہے۔ کوئی پندرہ بیس روز تک مجھے فرصت ہو جائے گی گو اسوقت تو ؎

ٹھہر ٹھہر کے مرا بیخودی سے چونک اُٹھنا!
جنوں سا ہے دل پُر اضطراب کے ہاتھوں

یہ تو رہی بندی کی حالت۔ لیکن آپ بھی ذرا خبردار رہئے گا۔ کیونکہ ؎

کھل جاتے ہیں کھل جاتے ہیں سب!
چھپتے نہیں چھپتے نہیں آثارِ محبت!!
بس اب ہنسنے کا نہیں۔ تسلیم

آپ کی ہمسفر
"زہرہ"

"بھئی" ڈاکٹر بولا "خوب لکھتی ہے۔ تم نے کیا جواب دیا"
میں نے کہا۔

"اب سوال وجواب کے ذکر کو تم رہنے ہی دو۔ اگر اسی طرح میں تمہیں سبھی خط سنانے لگوں تو رات ختم ہو جائے گی لیکن یہ قصہ ختم نہ ہوگا۔ رومان تو اب ختم ہو لیا۔ اب تم اصل قصہ سنو۔ بہت روز تک خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ اور آخر زہرہ نے مجھے یہ بتلا دیا کہ وہ فلم ایکٹرس ہے۔ لیکن اس کا فلمی نام کچھ اور ہے۔ رہا اس کا حسب ونسب تو نہ تو مجھے اس کے متعلق کریدنا تھی اور نہ وہ بقول خود گڑے مُردے اُکھیڑنا پسند کرتی تھی۔ اس نے مجھے لکھ دیا تھا کہ اس کا کام ختم ہونے والا ہے۔ اور وہ عنقریب وطن واپس چلی جائیگی۔ اور مجھے روانگی سے دو چار دن پہلے اطلاع دیگی۔ چنانچہ ایک روز اسی مضمون کا اُس کا خط آگیا۔ اس میں اس نے مجھے لکھا تھا کہ۔

فلم کمپنی سے اس کا معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔ اور وہ ایک دو دن میں

روانہ ہو جائے گی۔ اسباب وغیرہ تو اُس کی ماں اور نوکر چاکر وطن لے جائیں گے۔ اور وہ دس پندرہ روز میرے پاس قیام کرے گی۔ اس لئے میں فوراً کوئی مکان کرایہ پر لے لوں اور اس کی آمد کی تار کا منتظر رہوں۔

میں جس جگہ مقیم تھا یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ سو پچاس بنگلے بھی تھے لیکن یہ سب رُکے ہوئے تھے۔ بازار میں کئی ایک بالاخانے بھی تھے۔ لیکن یہ مجھے پسند نہ تھے۔ شہر سے باہر دھوبی گھاٹ کے پاس ایک دو منزلہ مکان تھا۔ آخر یہی مجھے پسند آیا۔ جب میں اس مکان کے مالک سے ملا اور اس سے اُس کے متعلق بات چیت کی تو وہ کچھ مُسکرانے لگا۔ جب میں نے ایک مہینے کا پیشگی کرایہ پیش کیا تو وہ بولا۔

"جلدی کیا ہے۔ پھر کسی وقت دیدیجئے گا"

میں نے کہا

"پہلے کیا اور پیچھے کیا۔ اب لے لینے میں کیا مضائقہ ہے؟"

وہ ہنسکر کہنے لگا۔

"کرایہ لینے میں تو مجھے انکار نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ مکان آپکو پسند نہ آئے گا"

"پسند ہی ہے تو لے رہا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو ٹھیک ہے" اُس نے کہا "لیکن کوئی کرایہ دار ایک دو دن سے

یہاں زیادہ نہیں ٹھہرتا۔"

"کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ مجھے معلوم نہیں۔" اُس نے جواب دیا۔

"کیا اس میں بھوت رہتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"میں تو عرض کر رہا ہوں۔" مالک مکان نے جواب دیا۔ "کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ آپ ان لوگوں سے پوچھئے جو یہاں ایک آدھ دن قیام کر کے بوریا بستر لپیٹ کر چلدیتے ہیں۔"

تو قصہ مختصر میں نے مکان کرایہ پر لے لیا۔ اور مالک نے چابی میرے حوالے کی۔ نیچے کی منزل میں ایک کھانے کا کمرہ ایک نشست و برخاست کا کمرہ۔ دو سونے کے کمرے غسلخانہ پینٹری اور باورچی خانہ وغیرہ تھا۔ اور اوپر کی منزل میں صرف دو کمرے اور ایک غسلخانہ تھا۔ ضرورت کا کچھ مختصر سا سامان بھی تھا۔ میں نے اپنی رہائش کے لئے اوپر کے دونوں کمرے درست کروائے۔ لیکن زہرہ کے آنے تک قیام ہوٹل ہی میں رکھا۔ یہ مکان لینے کے دو روز بعد زہرہ نے اپنی روانگی کا تار دیا۔ تار مجھے شام کو ملا۔ اگلے روز صبح کی گاڑی میں وہ بھی آگئی۔ چونکہ یہ مکان شہر سے باہر تھا اور اس کے گرد و پیش کا منظر دشت و جبل بھی بہت دلکش تھا۔ زہرہ کو بہت پسند آیا۔

ناشتہ کرنے کے بعد باتیں کرنے جو بیٹھے تو بارہ بج گئے اور یہ سلسلہ

اُس وقت منقطع ہوا۔ جب نوکر نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔ کیا کیا باتیں ہوئیں یہ ایک بہت طویل داستان ہے۔ تم جانو کہ زہرہ نے ایک عورت کے جذبات کی ناؤ میں بہتے ہوئے عمر بھر کی کہانی سنا ڈالی۔ اُس نے مجھے صاف صاف لفظوں میں بتلا دیا کہ وہ ایک بیسوا کی لڑکی ہے۔ باپ تو چھٹپنے میں ہی مر چکا تھا۔ پرورش ماں نے کی۔ اور حُسن فروشی کے اڈے پر بھائی نے بٹھلایا بلکھنا پڑھنا اُس نے اِدھر اُدھر سے سیکھ لیا۔ جب تک بھائی زندہ رہا وہ حُسن فروشی کی دوکان سجا کر بیٹھتی رہی لیکن جب وہ بھی عدم کو سدھارا تو اس نے فلمی زندگی اختیار کر لی۔ اُسے اِس بات پر فخر تھا کہ اس فن میں اس نے کافی نام پیدا کر لیا ہے۔ زہرہ نے باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ فی الحال فلمی زندگی سے کنارہ کش ہونے کا اُسکا ارادہ نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہنستے ہنستے اُس نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ میری لئے بھی اس سے اب پلا چھڑانا آسان نہ ہوگا

کھانے پر بھی کچھ اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو اس نے اپنا سوٹ کیس کھولا۔ اور یہ سونے کی رسٹ واچ جو تم میری کلائی پر دیکھ رہے ہو نکال کر مجھے دی۔ اس کے علاوہ چند ایک اور قیمتی تحائف بھی وہ لائی۔ شام سے کچھ پہلے ہم دونوں سیر کو نکل گئے۔

نو بجتے بجتے ہم رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اوپر کی منزل پر آ بیٹھے مشرقی پہاڑوں کی چوٹیوں پر چاند جلوہ آرا تھا اور چاندنی چھٹک چھٹک کر دشت

دجیل کی معصومیت پر قربان ہو رہی تھی۔ میں اور زہرہ آمنے سامنے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ زہرہ نے اُسوقت ایک بہت خوبصورت کامدار ساری پہنی ہوئی تھی۔ کانوں میں حلقے دار آویزے تھے گلے میں ایک خوبصورت ہار تھا۔ بجلی کی روشنی میں ساری کا سلمہ ستارہ اور آویزوں اور ہار کے بکھرے چھوٹے چھوٹے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ باتیں کرتے کرتے جب ہنستی تو دُرِ دندان مرجان ایسی خوبصورت ہونٹوں کے درمیان بہت دلآویز معلوم ہوتے۔ اُسنے اپنی پیاری پیاری باتوں اور باتیں کرنے کے انداز سے کمرے میں حسن و عشق کی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ اور خدا کی قسم اس وقت میں اپنے بخت کی رسائی پر خوش ہو رہا تھا۔ کہ ایک حسین اور شوخ و شنگ نوجوان عورت میرے خفتہ جذبات کو اپنے خدنگ نظر سے بیدار کر رہی ہے۔

اُسوقت دس ساڑھے دس کا وقت تھا کہ نوکر نے باہر سے آواز دی "کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دروازہ بند کر دوں جناب!" نوکر نے پوچھا۔ "آپ کہیں باہر تو نہیں جائیں گے اب۔"

"بند کر دو۔" میں نے اندر سے جواب دیا۔

"ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی بند کر دوں؟" نوکر نے پوچھا۔

"سب کمرے بند کر دو۔" میں نے جواب دیا۔

نوکر چلا گیا۔ ہم پھر باتیں کرنے لگے۔ زہرہ کا پلنگ کھڑکی کے پاس تھا اور کھڑکی میں سے چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمکتا نظر آ رہا تھا۔ زہرہ چاند کی طرف دیکھ کر بولی

"جانے! یہ چاند کے سینے پر داغ کیسے ہیں؟"

"شاید! میں نے جواب دیا۔" میرے داغ دل کا پرتو ہوگا۔"

"ابھی آپ کے دل کے داغ مٹے نہیں۔" زہرہ نے ایک انداز مجوبانہ سے سر ہلا کر پوچھا۔

"داغ کیسے مٹ سکتے ہیں زہرہ؟" میں نے کہا۔

"جب ایک حسین عورت کا سرد مرد کے سینے پر ہو۔" زہرہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "کیوں؟"

میں نے بناوٹ سے ایک آہ بھر کر کہا۔ "جب ہوگا"

یہ سنکر زہرہ جست بھر کر اُٹھی اور اپنا خوبصورت سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ اس وقت کسی کے زینہ پہ چڑھنے کی آواز سنائی دی۔

"یہ کمبخت پھر کیوں آگیا۔" میں نے کہا۔

"شاید کوئی کام ہو اُسے۔" زہرہ نے جواب دیا۔

ساتھ ہی کسی کے نیچے اُترنے کی آواز آئی۔

"آیا بھی اور چلا بھی گیا۔" زہرہ نے مسکرا کر کہا۔ "کہیں ڈر تو نہیں آرہا اُس غریب کو۔"

"ڈرنے والا تو نہیں"۔ میں نے جواب دیا۔

زہرہ کا سر میرے سینے پر تھا۔ اور سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو سے میرا دل و دماغ معطّر ہو رہا تھا۔ اور وہ ہولے ہولے میٹھے میٹھے سروں میں

بسو میرے نین میں

میں دیکھوں تو ہے دن رات!

الاپ رہی تھی کہ پھر کسی کے زینے پر چڑھنے کی آواز آنے لگی۔

"لو پھر آیا"۔ زہرہ نے ہنسکر کہا۔

"دیکھوں!" میں نے کہا" یہ کرتا کیا ہے"۔

زہرہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ساتھ ہی زینے سے اُترنے کی آواز آنے لگی۔ میں جست بھر کر کمرے سے باہر نکلا اور ٹارچ روشن کر کے سیڑھیوں کے پاس جا کر جھانکنے لگا۔ لیکن سیڑھیاں خالی تھیں۔ میں نے نیچے جا کر نوکر کو آواز دی۔ وہ اپنے کمرے میں تھا میری آواز سُنکر اُس نے دروازہ کھولا۔ اور پوچھا۔

"کیا حکم ہے جناب!"

"تم سو رہے تھے"۔ میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب!" نوکر نے جواب دیا۔

"تم اوپر کیا کرنے آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"کب جناب؟" اُس نے میری طرف تعجب سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی ابھی!" میں نے کہا۔

"میں نے جانا۔" نوکر بولا "کہ جناب نیچے تشریف لائے ہیں۔ میں نے جناب کے نیچے اُترنے اور اوپر جانے کی آواز سُنی تھی۔"

"دروازہ کب بند کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو کھانا کھانے کے بعد ہی بند کر دیا تھا۔" نوکر نے جواب دیا۔

"تو پھر تم مجھ سے پوچھنے کیوں آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال تھا کہ آپ کہیں باہر تشریف لے گئے ہوں۔" نوکر نے رک رک کر جواب دیا۔

"کہیں آج بھنگ تو نہیں پی لی۔" میں نے کہا۔

"نہیں جناب!" نوکر نے جواب دیا۔

"اِدھر آؤ!" میں نے کہا۔ "دیکھیں تو یہ کھٹکا کیسا ہوا تھا۔"

میں نے نوکر کو ساتھ لیکر سب کمرے دیکھے۔ کوئی خلاف معمول بات نہ تھی۔

"تو یہ سیڑھیوں پر کھٹکا کیسا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

نوکر نے کچھ جواب نہ دیا۔

"شاید!" میں نے کہا۔ "کچھ دھوکا ہی ہوا ہو۔"

"نہیں جناب!" نوکر نے کہا۔ "آواز تو میں نے بھی سنی تھی۔"

"کسی کے اوپر آنے کی۔" میں نے پوچھا۔

"اور باہر کا دروازہ کھلنے کی بھی جناب!" نوکر نے کہا۔

"کب! میں نے پوچھا۔

"جب ہی تو میں پوچھنے آیا تھا" نوکر نے جواب دیا۔

"عجب تماشہ ہے۔ میں نے ہنسکر کہا۔

"جناب آرام فرما دیں" نوکر نے کہا "میں دھیان رکھوں گا"

میں جب اوپر پہنچا تو زہرہ شب خوابی کا بہت خوبصورت سپید ریشمی لباس پہنے آنکھیں بند کئے پلنگ پر لیٹی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے پلنگ پر یاسمن کا پھول پڑا ہے۔ میں نے جو ذرا گدگدی کی تو وہ ہنسکر بولی۔

"اوہو! میں تو ایک سہانا خواب دیکھ رہی تھی۔ آپ نے مجھے جگا کیوں دیا"

"کیسا خواب؟" میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ سنیں گے" اُس نے نیم باز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے جھک کر اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے

"ضرور"

زہرہ مسکرا کر بولی۔

"میں اسوقت ایک باغ میں تھی۔ اُس باغ میں محبت کے گل بوٹے

تھے۔ ان گل بوٹوں سے محبت کی بُو باس آ رہی تھی۔ میرا دماغ معطر ہو رہا تھا۔ اُس باغ کا مالی بھی ....."

اتنا کہہ کر اُس نے مُسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"کون تھا مالی؟" میں نے اُس کے خوبصورت سینے پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

"اُسکے تنفس سے بھی اُسوقت بوئے محبت آ رہی تھی"۔ "بتلا دوں"۔ زہرہ نے نیم باز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں!" میں نے کہا۔ "بتلاؤ"

"مالی بھی میرا جانا پہچانا ہوا تھا" زہرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کون تھا؟" میں اس قدر اس پر جھک چکا تھا کہ ہماری پیشانیاں ایک دوسرے سے مل گئی تھیں

زہرہ نے مجھے بھینچکر سینے سے لگا لیا۔ اور کہا۔

"آپ"

ایک نوجوان عورت کے جذبات کو بیدار دیکھکر چاند شرماتا ہوا دریچے سے پرے کھسک گیا۔

رات کی خاموشی اور نکھری ہوئی چاندنی۔ بن کی مخمور ہوا اور پہلو میں محبوب جانواز! ایسے میں نیند کہاں؟ لیکن کمبخت وقت کو تو آج پر لگے تھے

گیارہ سے بارہ اور بارہ سے ایک کروٹ بھی نہ بدلی تھی کہ بج گئے۔ اچانک کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نیچے تشریف لائیے جناب جلدی۔" نوکر نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"جلدی کیجئے جناب!" جواب ملا۔

دو چار منٹ بعد جب میں نے دروازہ کھولا تو نوکر دیوار سے سہما ہوا لگا کھڑا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جو باورچی خانہ ہے نا جناب" نوکر نے خوفزدہ آواز سے کہا۔

"بس اُس میں ....."

"اُس میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جناب نیچے چلئے"

زہرہ بھی شب باشی کے لباس کے اوپر ڈریسنگ گاؤن پہنکر باہر آگئی اور میرے شانے پر ہاتھ رکھکر بولی۔

"خیر تو ہے؟"

"یہ کمبخت ڈر گیا ہے" میں نے جواب دیا۔

"نہیں جناب! نوکر بولا" خود چل کر دیکھ لیجئے"

"زہرہ!" میں نے کہا۔ "تم ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔"
"نہیں!" وہ بولی۔ "میں آپ کو اکیلے نہ جانے دوں گی۔ میں بھی چلونگی۔"
ہم تینوں نیچے آئے۔ میں آگے آگے۔ بیچ میں زہرہ اور عقب میں نوکر ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی۔

سیڑھیاں اُتر کر ہم جب ڈرائینگ روم میں آئے تو میں نے روشنی کرنے کے لئے بجلی کا بٹن دبایا۔ لیکن لیمپ روشن نہ ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کرنٹ بند ہے۔

زہرہ نے ہولے سے کہا۔
"کہیں اُس نے "مین سوئچ" نہ بند کر دیا ہو۔"
میں نے نوکر سے پوچھا۔
"مین سوئچ تو بند نہیں۔"
"نہیں جناب!"
"جاؤ دیکھو!" میں نے اُس کی طرف ٹارچ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو ٹارچ۔"

اُس نے ٹارچ میرے ہاتھ سے لے لی اور ڈرتے ڈرتے کمرے سے باہر نکلا۔ "مین سوئچ" باورچی خانے کے پاس تھا۔ ہم دونوں اندھیرے میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے تھے۔ کہ اچانک نوکر کے چیخنے کی آواز آئی

ہم دونوں لپک کر اس کی طرف گئے۔ وہ دیوار سے لگا خوف سے کانپ رہا تھا۔ ٹارچ کا شیشہ اُس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔

"کیا ہوا؟" ہم دونوں نے پوچھا

اُس نے باورچی خانے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا میں نے ٹارچ اُٹھا کر باورچی خانے میں روشنی ڈالی لیکن وہ بالکل خالی تھا۔

"کمبخت!" میں نے نوکر سے کہا۔ "آج کس وہم کا شکار ہو گئے تم۔ جاؤ سو رہو۔"

"نہیں جناب!" نوکر نے کہا۔ "میں بھی آپ کے پاس بیٹھوں گا۔"

ٹوٹی ہوئی ٹارچ کی روشنی بھی کچھ برائے نام ہی تھی۔ ہم تینوں ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔

دس منٹ پندرہ منٹ بیس منٹ گذر گئے۔ رات بھی خاموش کمرے کی فضا بھی خاموش ہم تینوں بھی خاموش بیٹھے تھے۔ میں اُسوقت مکان کے مالک کی گفتگو پر غور کر رہا تھا۔

"کوئی کرایہ دار ایک دو دن سے یہاں زیادہ نہیں ٹھہرتا۔" اور "بعض تو ایک آدھ روز قیام کر کے بوریا بستر باندھ کر چل دیتے ہیں۔"

لیکن اُسوقت تک میں نے آنکھوں سے تو کچھ دیکھا نہ تھا جو میں کوئی رائے قائم کر سکتا۔ آخر زہرہ نے ہی اس روح فرسا سکوت کو توڑا۔

اور نوکر سے پوچھا۔

"آخر ہوا کیا تھا جو تم چلانے لگے۔ کیا دیکھا تم نے"

"بی بی!" نوکر بولا۔ خدا جانے اس گھر میں بھوت ہیں یا جن پری رہتے ہیں آپ کھانا کھا کر اوپر گئے تو میں نے باہر کا دروازہ بند کر دیا۔ اور باورچی خانہ میں آکر کھانا کھانے لگا۔ اچانک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اوپر سے نیچے اتر رہا ہے۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے جانا کہ شاید آپ چہل قدمی کے لئے باہر تشریف لے گئے ہوں گے۔ کھانا کھا چکنے کے بعد جب میں باورچیخانے سے باہر نکلا تو اوپر کمرے میں آپ کے چلنے کی آواز آئی۔ میں نے سمجھا کہ شاید آپ واپس تشریف لے آئے ہوں گے۔ میں برتن صاف کرنے بیٹھ گیا۔ کہ اتنے میں پھر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کسی کے آنے جانے کی آواز آئی۔ میں اب بھی یہی سمجھا کہ آپ کسی کام کو نیچے آئے ہوں گے۔ خیر! میں نے اوپر آکر پوچھا اور آپ کا جواب سُنکر نیچے چلا گیا اور کمرے میں جا کر لیٹ رہا۔ شاید مجھے نیند آگئی تھی کہ اتنے میں باورچی خانے سے کسی برتن کے گرنے کی آواز سُن کر میں چونک پڑا۔ میں نے سمجھا کہ شاید کوئی بلی کہیں سے گھس آئی ہوگی۔ میں دروازہ کھول کر باورچی خانے کی طرف جو گیا تو بی بی! توبہ ہے میری! میں نے وہاں ایک آدمی کو دیکھا وہ کوئی چیز تلاش کر رہا تھا۔ میں چپکے سے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا کہ جب وہ باہر نکلے تو اُسے دبوچ لوں۔ پھر اُس نے الماری کھولی اور اندر سے گوشت کاٹنے

والی چھری نکال لی۔ یہ دیکھ کر میں وہاں سے ہٹ کر اوپر آیا اور آپ کو جگایا۔ اس کے بعد جب آپ نے مجھے ٹارچ دی اور بجلی دیکھنے کو کہا تو جب میں باورچی خانے کے پاس آیا تو میں نے ٹارچ کی روشنی اندر جو ڈالی تو وہی آدمی چھری سل پر رگڑ کر تیز کر رہا تھا۔

یہ سُنکر میں جلدی سے اُٹھا اور یہ کہتے ہوئے

"کمبخت مجھسے اسیوقت کیوں نہ کہا" ٹارچ اس کے ہاتھ سے لیکر باورچی خانہ کو چلا تو زہرہ بھی ساتھ ہولی اور نوکر بھی۔ لیکن باورچیخانہ خالی تھا۔ ہاں الماری کھلی تھی اور گوشت کاٹنے کی چھری بھی غائب تھی۔

"کہیں کوئی چور نہ گھس آیا ہو" زہرہ بولی "آپکے پاس کوئی لاٹھی واٹھی بھی تو نہیں"

ہم باورچی خانے میں ہی کھڑے تھے کہ ڈرائنگ روم کی جانب سے سبز رنگ کی روشنی ہماری طرف آتی نظر آئی۔ زہرہ نے زور سے میرا ہاتھ دبایا اور نوکر بولا۔

"وہ اِدھر ہی کو آرہا ہے جناب!"

روشنی بالکل نزدیک آگئی۔ اتنی نزدیک کہ باورچیخانے کا سامان صاف صاف نظر آنے لگا۔ اُس روشنی میں دو آنکھیں تاروں کی طرح چمکتی نظر آرہی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ روشنی ہم سے پرے ہٹنے لگی۔ اور ڈرائنگ روم

کے ساتھ جو کمرہ تھا اس میں غائب ہو گئی۔

"یہ کیا تھا؟" زہرہ نے پہلی بار بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا۔

اور نوکر بولا۔

"جناب! آپ مانیں یا نہ مانیں۔ یہ انسان تو نہیں۔"

"پھر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جو کچھ بھی جناب سمجھ لیں۔" نوکر نے جواب دیا۔

"پگلے ہو تم۔" میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے کہا۔ گو دل میں میں خود بھی حیران تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

"زہرہ!" میں نے کہا "تم اوپر چلو۔ میں ....."

لیکن وہ بات کاٹ کر بولی

"میں آپ کو اکیلا تو یہاں نہ رہنے دوں گی۔ آپ بھی اوپر چلئے!"

اور نوکر بولا۔

"اب یہاں کھڑے ہونے سے کیا فائدہ؟"

اور زہرہ بولی۔

"چلئے ڈرائنگ روم میں ہی چل کر بیٹھیں"

ہم تینوں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ ساتھ کے سونے والے کمرے کا دروازہ کھلا

"یا اللہ!" بیساختہ نوکر کے منہ سے نکلا۔

اور زہرہ نے بھی خوفزدہ ہو کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے پھر وہی سبز روشنی نمودار ہوئی۔ اس سبز روشنی میں پہلی بار ہمیں ایک آدمی نظر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں چھُری تھی۔ نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ وہ کمرے سے نکلکر ڈرائنگ روم کے دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ ہمیں ایسا معلوم ہونے لگا گویا وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ زہرہ نے خوفزدہ ہو کر میری بغل میں مُنہ چھُپا لیا۔ اور نوکر اس طرح سانس لینے لگا۔ جیسے کوئی ہل جُتا بیل ہانپ رہا ہو۔ پھر یہ چھُری والا آدمی دوسرے سونے والے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اب ہمیں اس کے قدموں کی آواز بھی سُنائی دی۔ اُس کے جاتے ہی ہم تینوں اُٹھے اور ڈرائنگ روم کے دروازے پر آکر کھڑے ہو گئے کیونکہ وہ چھُری والا سونے والے کمرے کے دروازے کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ سبز روشنی میں اب وہ ہمیں صاف صاف نظر آرہا تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور اندر سے ایک نوجوان عورت جس نے شب عروسی کا لباس پہنا ہوا تھا اور ایک نوجوان آدمی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے نکلے۔ دونوں ہنس رہے تھے۔ اور ان کے ہنسنے کی آواز ہمیں بھی سنائی دے رہی تھی یہ دونوں ہماری طرف ہی آرہے تھے۔ اُنھیں آتے دیکھ کر ہم جلدی سے راستہ چھوڑ کر ڈرائنگ روم کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ دونوں ڈرائنگ روم میں آکر صوفے پر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے سے

اختلاط کرنے لگے۔ اچانک اس عورت نے چیخ ماردی وہ چھری والا چھری ہاتھ میں پکڑے کمرے میں آیا اور آتے ہی عورت کے ساتھ جو آدمی تھا اُسے دبوچ لیا ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں چھری چمکی۔ اور میرے نوکر نے دہشت زدہ ہوکر ایک چیخ ماری اور خون! خون! کہتا ہوا گرتا پڑتا کمرے سے نکلا اور مکان کا دروازہ کھول کر اسی طرح چیختا چلاتا باہر بھاگ گیا ادھر زہرہ مجھ کو چمٹی خوف وہراس سے کانپ رہی تھی۔ اور وہ عروس تو دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپائے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس چھری والے نے اُس آدمی کو پچھاڑ کر چُھری اس کی گردن پر پھیر دی۔ ساتھ ہی کمرے میں دو چیخوں کی آواز گونجی ایک آواز زہرہ کی تھی۔ دوسری اُس عورت کی۔ مرد کو قتل کرنے کے بعد اُس نے اس عورت کو ہاتھ سے پکڑ کر صوفے سے کھینچ لیا اور مقتول کے سینے پر گرا کر اُسے بھی ذبح کر ڈالا۔

یہ خوفناک خونی منظر دیکھ کر زہرہ بیہوش ہوگئی۔ اور اگر میرا ہاتھ اُس کی کمر میں نہ ہوتا تو شاید بُری طرح فرش پر گرتی۔ میں ابھی زہرہ کو سنبھال ہی رہا تھا کہ کہیں پڑوس سے مُرغ سحر کی آواز سنائی دی۔ کمرے میں کامل سکوت اور اندھیرا تھا۔ جو کھیل میں نے دیکھا تھا ختم ہوچکا تھا اور اس ڈرامہ کے ایکٹر روپوش ہوچکے تھے۔

ہلکی ہلکی روشنی دل شکستوں کی آس کی طرح کمرے میں اُجالا کر

رہی تھی۔ میں نے زہرہ کو فرش پر سے اُٹھا کر صوفے پر لٹا دیا۔ اور اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔

بہت دیر کے بعد اُس نے آنکھیں کھولیں اور بولی "مار ڈالا اُسے بھی۔ ہائے! آپ نے اس عورت کو تو بچا لیا ہوتا"

اتنا کہہ کر اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ صبح ہوتے ہوتے بے ہوشی تو دور ہو گئی۔ لیکن حواس ٹھکانے نہ ہوئے۔ میں حیران تھا کہ اب کیا کروں آخر ڈبل روٹی والے کی آواز آئی۔ میں نے اسے اندر بلا لیا۔ اور ایک رقعہ لکھ کر مکان کے مالک کی طرف بھیجا۔ کوئی دس بجے کے قریب مکان کا مالک ایک ڈاکٹر کو ساتھ لیکر آیا اور مریضہ کو دیکھا۔ پھر میں نے رات کی سرگذشت سُنائی۔ تو قصہ مختصر زہرہ کو ہسپتال پہنچا دیا گیا اور میں اسباب اُٹھوا کر پھر ہوٹل میں لے آیا۔ دن بھر میں زہرہ کے پاس رہتا۔ رات ہوٹل میں آکر سو رہتا۔ زہرہ کبھی ہوش کی باتیں کرتی کبھی واہی تباہی بکنے لگتی نوکر بازاروں میں "خون! خون!" کے نعرے لگاتا پھرتا تھا۔ پولیس والے اُسے پکڑ کر چوکی پر لے آئے لیکن وہ بالکل پاگل ہو چکا تھا۔ میں نے اُسے بھی ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ کوئی پندرہ بیس روز اسی طرح گذر گئے۔ نوکر کو تو ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دیدیا۔ اور میں زہرہ کو یہاں لے آیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تمہیں معلوم ہی ہے۔ نوکر پاگل خانے میں اور زہرہ قبر کی آغوش میں۔

ہم دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں نے ریڈیو سٹ کھولا
کسی ریڈیو اسٹیشن سے کوئی نہایت سوز بھری آواز میں گا رہا تھا ؎

ہائے کس وقت ہوئیں دونوں مرادیں حاصل
یار بالیں پہ جب آیا تو قضا بھی آئی

16499

قلندر

قلندر

مدت کی بات ہے جب وطن کے ہنگامے مجھ پر گراں ہونے لگے تو واقعات سے مجبور ہو کر آخر ایک روز اپنا مختصر سا رخت سفر سمیٹ کر میں ایک گاؤں میں آ گیا

یہ گاؤں پہاڑ کے دامن میں تھا۔ کوئی دو یا اڑھائی سو نفوس کی آبادی تھی۔ گاؤں والے زیادہ تر جنگل میں سے لکڑی کاٹنے کا کام کرتے کچھ بُری بھلی کھیتی باڑی بھی کر لیتے۔ کہیں پاس ایک کوہستانی رود بار دو پہاڑوں کے درمیان میں بہتی تھی۔ پانی اتنا تیز کہ پاؤں ڈالنا جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ دیودار اور چیل کے درختوں کا جنگل دونوں طرف تھا۔ اس جنگل میں ریچھ، بھیڑیئے اور چیتے کثرت سے ملتے تھے۔ لانبی لانبی گھاس میں

بڑے بڑے موذی سانپ بھی چھپے رہتے۔ لیکن گاؤں والے غریب پیٹ کی خاطر ان آفات کی موجودگی میں بھی دن بھر جنگل میں کام کرتے۔ بڑے بڑے درخت گراتے اور ہزار دقت سے انھیں کھینچ کھانچ کر دریا کے کنارے پر لاتے اور پانی میں پھینکدیتے۔

جنگل میں کام کرنیوالوں کا جمعدار کٹے ہوئے درختوں کی گنتی کرتا اور کام کرنے والوں کو چھ آنے یومیہ کے حساب سے آٹھ دن بعد اُجرت ادا کرتا میں اسی چوکیدار کے پاس مقیم تھا۔ چوکیدار کا نام جبار تھا۔

جبار سے میری بہت دیر سے ملاقات تھی۔ یہاں آنے سے پیشتر وہ شہر میں جہاں میں رہتا تھا دریا کے گھاٹ پر ملازم تھا۔ میں سیر کے لئے دونوں وقت دریا پر جایا کرتا یہیں میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اُسکی جورو بیمار تھی۔ مجھے کچھ ہومیوپیتھی میں دسترس تھی میں نے علاج کیا جبار کی بیوی اچھی ہوگئی۔ وہ کچھ معاوضہ دینا چاہتا تھا لیکن میں نے کچھ لینا پسند نہ کیا۔ کبھی کبھار اس کے وطن سے جب کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ میرے لئے شہد منگوالیا کرتا۔ کوئی پانچ سات سال کے بعد جبار وطن واپس چلا گیا مہینے میں دو ایک خط اُس کے میرے نام آتے اور ہر خط میں یہی تقاضا ہوتا کہ چند دن کے لئے میں بھی اس کے وطن کی سیر کروں۔

مجھے جبار کے پاس ٹھہرے بہت روز ہوچکے تھے۔ لوگ مجھے حکیم جی کہہ کر خطاب کرتے۔ دُور دُور تک میری حکمت کی شہرت تھی۔ معاوضہ کے طور پر کہیں سے شہد ملتا کہیں سے چلغوزے اور اخروٹ اور کبھی کوئی اللہ کا بندہ دو ایک روپے بھی دیدیتا۔ شہروں سے جب لکڑی کے سوداگر آتے تو یہ شہد اور چلغوزے اور اخروٹ بھی جو میرے پاس جمع ہوتے فروخت ہو جاتے۔

جب تک میں گاؤں میں رہتا دونوں وقت کا کھانا جبار کے گھر سے آتا۔ علاج معالجہ کے عوض ادھر ادھر سے جو گھی، آٹا، دال وغیرہ مجھے ملتا میں جبار کو دیدیتا۔ مجھے گو نہ اطمینان تھا کہ میں غریب جبار پر کسی قسم کا بار نہیں۔ جوں جوں میری حکمت کی شہرت پھیلتی گئی ویسے ہی میں گاؤں سے زیادہ باہر رہنے لگا۔ کبھی دو روز۔ کبھی پانچ سات روز۔ اور کبھی اس سے بھی زیادہ عرصہ!

اسی گاؤں میں کبھی کبھی ایک بوڑھا قلندر بھی آیا کرتا تھا جو قوم کا پٹھان تھا۔ چہرے بشرے سے معزز آدمی معلوم ہوتا تھا سیاہ کفنی اس کا لباس تھا اور رباب بجانے میں اسے ایسا کمال تھا کہ باید و شاید۔ لیکن بجاتا اپنی مرضی سے تھا۔ مجھ پر خاص نظر عنایت تھی۔ میں جب گاؤں میں ہوتا تو اکثر دریا کے کنارے وقت گذارتا۔ یہ رباب نواز قلندر جب گاؤں میں آتا تو میری پاس

آبیٹھتا۔ جو کچھ جھولے میں ہوتا نکال کر میرے آگے رکھ دیتا۔ کبھی رباب بجاتا کبھی ہاتھ کا سرہانہ بنا کر سو رہتا۔ کبھی لیٹے لیٹے گانے لگتا۔ کبھی پشتو میں کبھی اردو میں !!

ایک روز میں ندی پر بیٹھا تھا کہ بوڑھا قلندر بھی کہیں سے رباب بجاتا ہوا آنکلا۔ اور میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"سائیں جی! آپ کا وطن کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"حکیم!" اس نے گاؤں کے گورستان کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"ادھر!"

"وہ تو سب کا وطن ہے" میں نے کہا۔

"یہی اصل وطن ہے" بوڑھے قلندر نے جواب دیا۔

"پھر بھی" میں نے پوچھا "کہیں گھر بھی تو ہوگا"

"گھر ہوتا!" قلندر نے جواب دیا "تو دربدر کیوں پھرتا۔ تم یہاں کیسے آیا؟"

"وطن کی ہوا جب راس نہ آئی تو یہاں آگیا" میں نے جواب دیا۔

"راس کیوں نہ آئی" بوڑھے قلندر نے پوچھا۔

"جب زمانے کی ہوا بدلی" میں نے جواب دیا "جب ہوئے اپنے بیگانوں سے سوا!"

"بال بچہ بھی ہے؟" قلندر نے پوچھا۔

"اللہ کا نام!" میں نے جواب دیا۔

"حکیم! تم بھی دنیا کا ستایا ہوا ہے؟" قلندر نے پوچھا

"دنیا کا کیا قصور!" میں نے کہا۔ "قسمت کی بات ہے۔"

"سچ ہے۔" قلندر بولا۔ "کسی کو خاک کا بستر کسی کو سنگ مرمر دے! لیکن لطف تو یہ ہے کہ کسی کو خاک کا بستر بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اس غریب کی لاش جنگل کا چڑیا کھاتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"خدا کی باتیں خدا ہی جانے!"

"لیکن انسان بھی تو خلیفۃ اللہ ہے۔" بوڑھے قلندر نے کہا۔ "اسے بھی سب کچھ معلوم ہے۔"

میں نے کہا۔

"سائیں جی! عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی! خلیفۃ اللہ ہونے سے کیا بنتا ہے؟"

"سچ کہا حکیم تم نے۔" قلندر نے مسکرا کر کہا۔ "یہ جنت اور جہنم تو واقعی عملوں کا نام ہے لیکن ایک بات تم ہم کو بتلاؤ۔"

"فرمایئے!" میں نے کہا

"تصور اور خیال کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟"

"ان دونوں چیزوں کا تعلق دماغ سے ہے۔" میں نے جواب دیا

"ہم سمجھا نہیں۔" قلندر بولا۔ "دماغ کیا کرتا ہے؟"

"سُنئے!" میں نے کہا۔ "آپ کو کسی چیز کی جستجو ہے یا کسی چیز کی ضرورت ہے۔ یا کوئی چیز حاصل ہو کر کھو گئی ہے تو قدرتی طور پر آپ کو ہر وقت اسی کا خیال رہیگا۔ اور کبھی اس چیز کا تصور بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے آجائیگا یہ سب دماغ کا کرشمہ ہے۔"

"گویا!" قلندر بولا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔"

"خیال کی حقیقت کیا ہو سکتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ کو اگر کچھ فکر ہے یا کسی کی تلاش ہے۔ یا کسی کی یاد ہے تو بس آپ کا دماغ آپکو ہمیشہ اسی طرف متوجہ رکھے گا۔ اور کبھی آپ اس چیز کو ہُو بہُو اپنے سامنے موجود بھی دیکھیں گے۔"

"خواب میں جو صورت نظر آتا ہے۔" قلندر نے مسکرا کر پوچھا۔ "وہ بھی دماغ کا کام ہے۔"

"یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کی دو صورت ہے ایک تو یہ کہ جس چیز کا دن رات ہم کو خیال ہوگا۔ خواب میں بھی وہی نظر آئے گی۔ اور کبھی آنے والے واقعات کی بھی خواب میں انسان کو بشارت مل جاتی ہے۔"

"تم بہت گہرا بات کرتا ہے حکیم!" قلندر نے ہنسکر کہا۔ "تم ہم کو یہ بتلاؤ۔ جو لوگ مر چکے ہیں وہ بھی کبھی نظر آسکتے ہیں۔"

"بعض لوگ مانتے ہیں بعض نہیں مانتے" میں نے جواب دیا۔
"کسی کے ماننے یا نہ ماننے کا سوال نہیں" قلندر بولا "تمہارا کیا خیال ہے؟"
میں نے کہا۔
"مجھے اس مضمون سے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ اس لئے میں نے اسکا مطالعہ نہیں کیا لیکن آپ تو ایک خدا رسیدہ بزرگ آدمی ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے"
یہ سُنکر قلندر نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا "ہم خدا رسیدہ آدمی ہے۔ خوب کہا تم نے حکیم! بہرکیف ہمارا خیال تو یہ ہے کہ جس پر ظلم ہوا سکا روح کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا"
"کیوں؟" میں نے پوچھا۔
"محض پریشان کرنے کے لئے!" قلندر نے جواب دیا "دوسرے کا جینا حرام کرنے کے لئے۔ شاید انتقام لینے کو"
"کوئی واقعہ معلوم ہے آپ کو؟" میں نے پوچھا "کوئی دلیل بھی ہے آپ کے پاس؟"
"معلوم ہے حکیم" قلندر نے جواب دیا "لیکن شاید آپ کو اعتبار نہ ہوگا"
کیوں نہیں" میں نے کہا "آپ کی بات کو کون غلط کہے گا۔

"حکیم" قلندر ہنسکر بولا۔ "تم کس خیال میں ہے۔ ہم تو بڑا گنہگار ہے۔ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔"

"معاذ اللہ!" میں نے کہا۔ "ایسا مت کہیے۔ سونا اگر مٹی میں بھی ملا ہو تو چمک ویسی ہی رہتی ہے۔"

قلندر ہنسکر کہنے لگا۔

"ارے حکیم! تم ہماری اس سپید ریش پر دھوکا کھا گیا۔ بہت پاگل ہے تم۔ اچھا بتلاؤ۔ جنگلوں میں کون مارا مارا پھرتا ہے؟"

"جسے خدا کی جستجو ہو" میں نے جواب دیا۔ "جو جویائے حق ہو۔"

"کوئی اور بھی" اُس نے پوچھا۔

"جسے کسی کا عشق ہو" میں نے جواب دیا۔

"کوئی اور بھی" اُس نے پھر پوچھا۔

"جسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ میں نے جواب دیا۔

"کوئی اور بھی؟" قلندر نے پھر پوچھا۔

"میں نے ہنسکر کہا۔

"اور کون ہو سکتا ہے؟"

"مجرم بھی تو ہو سکتا ہے۔" قلندر نے مُسکرا کر کہا۔

"ہاں!" میں نے کہا۔ "ہو تو سکتا ہے لیکن جرم تو کبھی چُھپا نہیں رہتا۔"

"ٹھیک ہے حکیم!" قلندر بولا۔ جرم کبھی چھپا نہیں رہتا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ مجرم ہمیشہ گرفتار ہو جائے۔ کبھی بچ بھی جاتا ہے۔ کم از کم انسان کے قانون سے۔"

"درست ہے!" میں نے کہا۔ "لیکن اس بحث کو چھوڑیئے اور وہ واقعہ سنا دیجیے۔"

"سنو حکیم!" قلندر جو ہری ہری گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ میری طرف کروٹ بدل کر بولا۔ "ہم تم کو اپنے ملک کا ایک بات سناتا ہے۔"

"ارشاد!" میں نے کہا۔ "میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

بوڑھا قلندر کچھ دیر تو یونہی لیٹا رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔

"حکیم! تمہیں رباب سننے کا بھی تو کچھ شوق ہے؟"

"ہے تو سہی!" میں نے جواب دیا۔

"تو سنو!" یہ کہہ کر اس نے رباب سنبھالا۔

میں نے کہا

"اور وہ قصہ؟"

"تم پہلے رباب سنو حکیم!" بوڑھے قلندر نے رباب کے تاروں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

بوڑھا فقیر رباب بجانے لگا۔

رباب کی ہر تار مایوسی اور الم کی داستان سُنانے لگی۔ پھر راگ نے کسی شکستہ دل کی آہوں کی صورت اختیار کر لی۔ جیسے کوئی ہچکیاں لے رہا ہو۔ سسکیاں بھر رہا ہو۔ اور بجانے والا رباب کے نغموں میں کھویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"حکیم! گاؤں میں ایک لڑکی تھی۔ اتنی خوبصورت جیسے انار کا دانہ اتنی نازک جیسے شاخ گل۔ اس لڑکی کا نام یاسمن تھا لیکن گھر والے محبت سے اُسے سمّی کہہ کر پکارتے۔ سمّی کو دیکھ کر چاند بھی شرماتا تھا۔ سُنا حکیم!

"ہاں" میں نے جواب دیا۔ "سُن رہا ہوں"

"اور گاؤں میں ایک جوان لڑکا بھی رہتا تھا۔ بوڑھے قلندر نے کہا۔ اتنا بانکا اتنا خوبصورت جیسے شیر کا بچہ۔ اس کا نام فیروز گل تھا اور اسی گاؤں میں ایک ملک بھی تھا اور اس ملک کا بھی ایک بیٹا تھا۔ بس ایک ہی! اُس کا نام عزیز گل تھا۔ گھومنے گھامنے کے سوا اُسے اور کوئی کام نہ تھا۔ ملک کا جو بیٹا تھا۔ ٹھیک ہے نا حکیم؟

"ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا۔

"فیروز گل بھی یاسمن کو چاہتا تھا اور عزیز گل بھی لیکن یہ دونوں میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ سمّی کسے چاہتی ہے۔ چاندنی رات میں چشمے کے پاس جب گاؤں کی لڑکیاں بیٹھ کر گاتیں تو عزیز گل بھی اُن کے پاس جا بیٹھتا چونکہ وہ ملک کا بیٹا تھا اس لئے کوئی اُسے منع بھی نہ کرتا۔ فیروز گل چونکہ غریب تھا

اس لئے وہ اگر کہیں پاس جا نکلتا تو لڑکیاں بُرا مناتیں اور وہ وہاں سے چلا آتا۔ فیروز گل کا باپ لوہار تھا اور سمّی ایک زمیندار کی لڑکی تھی۔ فیروز گل کا باپ بھی غریب۔ سمّی کا باپ بھی غریب۔ لیکن عزیز گل کا باپ امیر آدمی تھا۔ اسکا گاؤں میں رعب بھی تھا۔ اور رسوخ بھی۔ اور اس کے پاس دولت بھی تھی۔ عزیز گل کا دوسروں سے لباس بھی اچھا ہوتا۔ گو وہ کچھ دُبلا پتلا سا تھا تاہم بہت شگفتہ مزاج جوان تھا۔ سُنتے ہو حکیم!"

"ہمہ تن گوش ہوں"۔ میں نے جواب دیا۔

قلندر بولا۔

"ایک روز راہ جاتے دونوں کا آمنا سامنا ہوگیا اور باتوں باتوں میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ عزیز گل اکڑ کر بولا۔

"زیادہ بکواس کروگے تو گاؤں سے نکلوا دوں گا"

"خیر" فیروز گل نے کہا" یہ تو بعد میں دیکھا جائیگا۔ لیکن اگر آج سے تم کبھی چشمے پر گئے تو اچھا نہ ہوگا"

"کیا ہوگا؟" عزیز گل نے پوچھا۔

"یہ وہاں بتلاؤں گا" فیروز گل نے جواب دیا۔

اتنے میں کھیتوں کی جانب سے یاسمن آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اسی طرف آرہی تھی۔ دونوں کو جھگڑتے دیکھکر پاس آکر کھڑی ہوگئی اور بولی

"کیا ہوا تمہیں۔ کیوں جھگڑ رہے ہو؟"

عزیز گُل بولا۔

"یہ کمینہ اب بہت سر چڑھ چلا"

"کمینہ!" فیروز گُل غضبناک ہو کر بولا "ٹھہرو....."

"ٹھہرو!" یاسمن دونوں کے بیچ میں آکر بولی "عزیز گُل! کیوں مفت میں فساد کرتے ہو۔ مان لیا کہ تمہارا باپ مالدار ہے لیکن غریبوں کو بھی عزّت کا پاس ہوتا ہے"

"تمہیں معلوم بھی ہے یہ مجھ سے کیا کہہ رہا تھا" عزیز گُل نے کہا۔

"کیا کہہ رہا تھا تم سے!" سمّی نے پوچھا۔

"یہ کہتا ہے کہ میں چشمہ پر نہ آیا کروں" عزیز گُل نے جواب دیا۔

"تم چشمہ پر کیوں آتے ہو؟" سمّی نے پوچھا۔

"تمہیں دیکھنے!" عزیز گُل نے جواب دیا۔

"عزیز گُل! میں ابھی تم سے کہہ چکی کہ غریبوں کو بھی عزّت کا پاس ہوتا ہے۔ کیا واسطہ ہے تمہارا مجھ سے" یاسمن نے ذرا بگڑ کر پوچھا۔

"واسطہ پوچھتی ہو سمّی!" عزیز گُل نے مُسکرا کر کہا۔

"ہاں!" یاسمن نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کہا۔

"سمّی!" عزیز گُل نے مُسکرا کر کہا "مجھے تم سے محبت ہے"

یہ سُنتے ہی فیروز گُل کی پیشانی پر شکن پڑ گئے۔ لیکن سمّی اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اس میں ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں بھی تو مجھ سے محبت ہے ہے نا؟"

"ہاں!" فیروز گل نے جواب دیا۔ اور میری ماں آج یا کل تمہارے گھر پیغام لیکر آنے ہی والی ہے۔"

"ابھی نہیں!" سمی بولی۔ "میں صرف اُس شخص سے شادی کروں گی جس کے سینے پر سونے کا تمغہ ہوگا۔ سُن لیا تم دونوں نے۔ بس یہ شرط ہے۔"

"وعدہ کرتی ہو" فیروز گل نے پوچھا۔ "قسم کھاؤ گی؟"

یاسمن بولی۔

"جسے محبت ہو وہ نہ وعدہ لیتا ہے۔ نہ قسم کھانے کو کہتا ہے۔"

"سمی!" فیروز گل سینہ پہ ہاتھ رکھکر بولا۔ "اگر زندگی ہے تو وہ دن بھی دور نہیں جب یہ سینہ سونے کے تمغے سے مُزیّن ہوگا۔"

اتنا کہکر وہ تو اپنی راہ پر ہولیا لیکن عزیز گُل وہیں کھڑا رہا۔

اگلے روز فیروز گُل کو سفر کی تیاری کرتے دیکھ کر اس کی ماں نے پوچھا

"کہاں جانیکا ارادہ ہے؟"

"میں پلٹن میں نوکری کروں گا۔"

"کیوں؟" ماں بولی۔ "دیکھتے نہیں تمہارا باپ آئے دن بیمار رہتا ہے

اور میں بوڑھی ہوں۔ تم چلے گئے تو ہماری گذران کیسے ہوگی"۔

"میں ہر مہینے تمہیں روپے بھیجوں گا" فیروز گل نے جواب دیا۔

"لیکن ابھی دو چار دن ہوئے تم نے مجھے سمّی کے لئے پیغام دینے کو کہا تھا"۔ ماں نے پوچھا "شادی نہیں کروگے"۔

"میں تو تیار ہوں" فیروز گل نے جواب دیا "لیکن سمّی نہیں مانتی"۔

"تم نے پوچھا؟" ماں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں!"

"کب؟"

"بس میں نے کہہ جو دیا" فیروز گل نے جواب دیا۔

"لڑکیاں یوں ہی کہا کرتی ہیں"۔ ماں نے کہا "میرا خیال ہے اسکی ماں مان جائے گی"۔ "کیا کہا تھا تمسے سمّی نے؟"

"سمّی نے کہا تھا کہ میں اُس شخص سے شادی کروں گی جس کے سینے پر سونے کا تمغہ ہوگا" فیروز گل نے جواب دیا۔

"تم نے کیا کہا؟" ماں نے مُسکرا کر پوچھا۔

"میں نے اُس کی شرط پوری کرنے کا وعدہ کرلیا ہے" فیروز گل نے جواب دیا۔

فیروز گل اپنا مختصر سا سامان لیکر اسی روز گاؤں سے چلدیا۔ سنتے ہو حکیم!"

"ہاں سائیں!" میں نے کہا "سُن رہا ہوں۔ خوب قصّہ ہے۔"

بوڑھا قلندر پھر رباب کی تاروں کو چھیڑنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رباب نہیں بج رہا بلکہ کوئی شکستہ دل فریاد کر رہا ہے۔

"حکیم!" قلندر نے رباب پر سے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "وقت کتنی جلدی گذرتا ہے۔ ایک سال بھی گذرا۔ دوسرا بھی گیا۔ اب تیسرا بھی ختم ہونے کو تھا۔ فیروز گل کی قسمت یاور تھی۔ وہ پلٹن میں جمعدار تھا۔ اُس کے سینے پر ایک کی بجائے تین تمغے تھے۔ دو چاندی کے ایک سونے کا۔ اُس نے پلٹن سے چھٹی لی۔ اور یاسمن کے لئے ریشمی کپڑے۔ سونے کی چوڑیاں۔ سونے کا ہار خرید کر وطن کو چل دیا۔ لیکن تین سال کے عرصے میں دنیا ہی بدل گئی۔ اس کی تقدیر ہی پلٹ گئی۔ سنتے ہو حکیم!"

"سب سُن رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا

بوڑھا قلندر کہنے لگا

"حکیم! یہی شام کا وقت تھا۔ تانگہ پتھریلی سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور فیروز گل تانگے میں بیٹھا بچوں کے کھاتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن سفر تھا کہ ختم ہونے میں آتا ہی نہ تھا۔ وہ کبھی تانگے والے سے اُلجھتا اور کبھی رباب بجانے لگتا۔ رباب بجاتا اور گاتا سنتے ہو حکیم!"

"جی ہاں! میں نے کہا۔ "سن رہا ہوں۔"

قلندر نے پھر رباب اُٹھا لیا اور رباب بجاتے ہوئے بولا۔

"حکیم! فیروز گل یاسمن کو یاد کرتا۔ رباب بجاتا اور گاتا ؎

شبِ غم کے کیسے سناؤں ستم!
تمہاری قسم!
بہت یاد آئے ہو تم!
تمہاری قسم!! تمہاری قسم تمہاری قسم!!

بس گاتا تھا اور رباب بجاتا تھا آخر وطن کے پیارے پیارے نشان اور دیکھی بھالی چیزیں نظر آنے لگیں۔ اچانک تانگہ کسی پتھر سے ٹکرایا ایک پہیہ ٹوٹ گیا۔ لیکن گاؤں ابھی دو اڑھائی میل کے فاصلہ پر تھا۔ فیروز گل نے اسباب تانگہ میں چھوڑا اور تلوار کمر سے باندھ کر پیدل چلدیا۔ تانگے والا بھی پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ کبھی فوجی انداز سے قدم اُٹھاتا کبھی کسی بھگوڑے سپاہی کی طرح بھاگنے لگتا۔ فیروز گل کا باپ تو اس کی عدم موجودگی میں ہی مرچکا تھا۔ ایک بوڑھی ماں تھی لیکن اس وقت نہ تو اُسے ماں سے ملنے کی جلدی تھی۔ نہ کسی دوست آشنا کو گلے لگانے کی آرزو۔ ایک یاسمن کا خیال تھا۔ اور اسی خیال سے اُمیدوں اور آرزوؤں کی بستیاں بساتا ہوا وہ چلا جارہا تھا۔

فیروز گل نے جسوقت گاؤں میں قدم رکھا تو اُسے طوطیوں اور شہنائیوں کی دلکش آواز سُنائی دی۔ اُسے اُسنے ایک نیک شگون سمجھا۔ اتنے میں دو لڑکے پاس سے گذرے۔ فیروز گل نے انھیں روک کر پوچھا۔

"یہ شہنائیاں کیسی بج رہی ہیں؟"

ایک لڑکے نے جواب دیا۔

"عزیز گل کی شادی ہے۔ اس کی برات جا رہی ہے۔"

"کون عزیز گل؟" فیروز گل نے پوچھا۔

"ملک کا بیٹا!" جواب ملا۔

"برات کہاں جا رہی ہے؟" فیروز گل نے پوچھا۔

جواب ملا۔

"سمیّ کے گھر۔"

لڑکے تو اتنا بتلا کر چل دیئے اور فیروز گل اسی جگہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ امیدوں اور آرزوؤں کی وہ بستی جو اُس نے ایک مدت سے آباد کر رکھی تھی، یکلخت برباد ہو گئی۔ سنتے ہو حکیم۔"

"سُن رہا ہوں!" میں نے جواب دیا۔

"برات اسی طرف آ رہی تھی۔" قلندر کہنے لگا "سمیّ کا گھر اسی طرف تھا۔ اور فیروز گل اپنے گھر جانے کی بجائے یاسمن کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ سامنے سے مشعلوں کی روشنی نمودار ہوئی۔ پھر براتی نظر آنے لگے پھر شہنائی نواز اس کے پاس سے گذرے۔ ان کے پیچھے مطربوں کا طائفہ تھا براتی ان کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ دس بیس قدم چلکر طائفہ کھڑا ہو جاتا جہاں فیروز گل بیٹھا تھا۔ طائفہ اس سے کچھ آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔ عزیز گل

گھوڑے پر سوار پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ آج خوب سجا ہوا تھا۔ گھوڑے کے ساتھ ایک مشعل والا تھا لیکن جب طائفہ کھڑا ہوا تو مشعل بردار بھی طائفہ والوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ درخت کے پاس پہنچکر عزیز گل نے گھوڑا روک لیا۔ اُس وقت وہ اکیلا تھا۔ اور یہاں اندھیرا بھی تھا۔ رقیب کو دیکھ کر فیروز گل کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے نیام سے تلوار نکالی اور ایک ہی ہاتھ میں عزیز گل کو کاٹ کر نیچے گرا دیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ کوئی اسے دیکھے۔ فیروز گل اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ سُنتے ہو حکیم!"

"توبہ ہے!" میں نے کہا۔ "عین شادی کے روز قتل کر ڈالا ظالم نے!"

"اُس نے بھی تو اُس کی آرزوں کا خون کر ڈالا تھا۔" بوڑھے قلندر نے جواب دیا۔ "ظلم کے بدلے ظلم!"

"پکڑا گیا پھر؟" میں نے پوچھا۔ "مارا گیا قصاص میں؟"

"نہیں!" بوڑھا قلندر بولا۔ "نہیں۔ رقیب کو قتل کرنے کے بعد وہ سیدھا اپنے گھر گیا۔ اس کی بوڑھی ماں چوکھٹ پر بیٹھی برتن صاف کر رہی تھی۔ فیروز گل کو دیکھتے ہی اُٹھی اور بھینچ کر اُسے سینے سے لگا لیا۔ ابھی ماں بیٹے بیٹھے باتیں کر ہی رہے تھے کہ گاؤں میں کہرام مچ گیا۔

"یہ شور کیسا ہے؟" فیروز گل نے پوچھا۔

"عزیز گل کی برات جا رہی ہے۔" ماں نے جواب دیا۔

"کہاں شادی ہے؟" فیروز گل نے پوچھا۔

"بیٹا!" بڑھیا بولی۔ "میں نے سمّی کی ماں سے وعدہ لے لیا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ تمہاری بات پکّی ہوگئی ہے۔ لیکن ملک نے زور ڈال کر سمّی کے ماں باپ کو مجبور کر دیا۔"

"کیوں؟" فیروز گل نے پوچھا۔

"عزیز گل کی خاطر۔" ماں نے جواب دیا۔ "سمّی بھی عزیز گل کو ہی چاہتی تھی۔ ملک کی بہو کہلانا کچھ کم عزّت تھی کیا؟"

"اور جو اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" فیروز گل نے پوچھا۔

"بیٹا! ماں بولی۔ "وہ تو محض تمہیں ٹالنے کو تھا۔"

اتنے میں خون! خون! قاتل! خونی! پکڑو پکڑو! کی آوازیں آنے لگیں۔

"یہ کون قتل ہوگیا۔" بڑھیا تعجب سے بولی۔

"خدا جانے!" فیروز گل نے جواب دیا۔

بڑھیا اُٹھ کر باہر گئی۔ پانچ سات منٹ بعد بہت گھبرائی ہوئی واپس آئی اور بولی۔

"کسی نے عزیز گل کو مار ڈالا ہے۔"

"دولھا کو!" فیروز گل نے پوچھا۔

"ہاں دولھا کو!" بڑھیا نے جواب دیا۔

"کس نے مارا؟" فیروز گل نے پوچھا۔

"یہ کسی کو معلوم نہیں"۔ بڑھیا بولی۔

"کسی نے قاتل کو دیکھا بھی"۔ فیروز گل نے پوچھا۔

"نہیں"۔ بڑھیا بولی۔ "برائی طائفہ والوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے قاتل کام کر گیا"۔

"جہنم میں جائے"۔ فیروز گل نے کہا۔

"جہنم میں تو جائے ہی گا"۔ بڑھیا نے کہا۔

"کون؟" فیروز گل نے پوچھا۔

"قاتل اور کون؟" بڑھیا نے کہا۔

دونوں میں اسی قسم کی کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ شور و غل اب بند ہو چکا تھا۔ فیروز گل اٹھ کر باہر جو جانے لگا تو ماں نے پوچھا۔

"کہاں چلے تم؟"

"ذرا اسباب دیکھتا ہوں"۔ فیروز گل نے کہا۔ "تانگہ ٹوٹ گیا تھا۔ دیکھتا ہوں ابھی تک آیا کیوں نہیں"۔

"نا بیٹا!" ماں بولی۔ "مت جاؤ باہر"۔

"فکر مت کرو!" فیروز گل نے کہا۔ "لیکن میرے آنے کا کسی سے ذکر مت کیجیو"۔

یہ کہکر وہ باہر چلا گیا۔ تانگے کی گھڑ گھڑاہٹ دور سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ راستے میں ہی تانگے والے سے جا ملا۔ تانگے والے نے پوچھا۔

"تم گاؤں نہیں گئے؟"

"میں گاؤں چلا جاتا تو اسباب کس کے حوالے کرتا" فیروز گل نے جواب دیا

"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا" تانگے والے نے مطمئن ہو کر کہا۔ "راہزن کا خطرہ تو یہاں قدم قدم پر ہے"

"اللہ مالک ہے" فیروز گل نے جواب دیا۔

دونوں گاؤں کی طرف چلے۔ جب گاؤں کے پاس پہنچے تو مسجد کے پاس دو چار آدمی بیٹھے تھے۔ فیروز گل کو پہچان کر بڑے تپاک سے ملے۔ پھر ان میں سے ایک نے عزیز گل کے قتل ہونیکا واقعہ بیان کیا۔

"کتنی دیر ہوئی؟" فیروز گل نے پوچھا۔ "کس نے مارا؟"

"ہو گئے تین چار گھنٹے!"

"قاتل پکڑا گیا؟" فیروز گل نے پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں؟"

"کون تھا؟" فیروز گل نے پوچھا

"یہ بھی معلوم نہیں"

"کسی نے دیکھا بھی نہیں" فیروز گل نے پوچھا۔

"نہیں!"

"پاس کوئی نہیں تھا" فیروز گل نے پوچھا۔

"سب طائفہ والوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے"

"یہ لوگ باتیں کرتے کرتے فیروزگل کو اس کے گھر پہنچا گئے۔ سنا حکیم؟"

"ہاں! میں نے کہا "بہت چالاک نکلا لیکن آخر پکڑا بھی تو گیا ہوگا؟"

"نہیں!" قلندر نے جواب دیا۔

"بھاگ گیا کہیں" میں نے پوچھا۔

"بھاگنے کی ضرورت ہی کیا تھی" بوڑھے قلندر نے جواب دیا "کسنے دیکھا تھا اُسے" تو خیر! اگلے روز وہ بھی عزیز گل کے جنازے میں شریک ہوا۔ اور دوسرے تیسرے روز اس کے باپ کے پاس جا کر گھڑی دو گھڑی بیٹھا بھی کرتا۔ دس پندرہ روز گذر گئے لیکن سمّی کہیں نظر نہ آئی لیکن ایک روز اسی چشمہ کے پاس اس سے ملاقات ہوگئی۔ وہ پانی بھرنے آئی تھی۔ اکیلی ہی تھی۔ فیروزگل کو دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سی گئی۔ دونوں چشمے سے ذرا ہٹ کر انار کے درختوں کے نیچے جا بیٹھے۔ سمّی کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ وہ آج بھی اتنی خوبصورت تھی جتنا گل رماں!

"کب آئے تم؟" سمّی نے پوچھا

"جب تم نے دیکھ لیا" فیروزگل نے جواب دیا۔

"بہت دنوں بعد وطن یاد آیا تمہیں" سمّی نے کہا۔

"تم نے جو شرط لگا رکھی تھی اُسے پورا کئے بغیر کیسے چلا آتا" فیروزگل نے جواب دیا۔

"شرط؟" سمّی بولی "مجھے تو کچھ یاد نہیں کیسی شرط؟"

فیروزگل نے اُسے اُسکا وعدہ یاد دلایا۔

"قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے" سمّی نے ایک آہ بھر کر کہا "کب تک رہو گے"

"اب تو واپس جانیکا ارادہ نہیں"۔ فیروز گل نے جواب دیا۔

"کیوں؟" سمتی نے پوچھا

"اب ضرورت ہی کیا ہے؟" فیروز گل نے جواب دیا۔

"لو!" سمتی اُٹھتے ہوئے بولی"میں تو اب چلتی ہوں"۔

"پھر کب ملو گی"۔ فیروز گل نے پوچھا۔

"کیا حاصل ہوگا ملنے ملانے سے؟" سمتی نے کہا۔

"عزیز گل یاد آتا ہے"۔ فیروز گل نے طنزاً کہا۔

"جو چیز پاس ہو" سمتی بولی۔"اُس کی یاد کیسی؟"

"بہت محبت تھی تمہیں عزیز گل سے"۔ فیروز گل نے پوچھا۔

"تھی کیا؟" سمتی بولی۔"ہے کہو"۔

"لیکن وہ ہے کہاں؟" فیروز گل نے کہا۔

سمتی نے دل پر ہاتھ رکھا اور بولی۔

"یہاں!"

یاسمن گاؤں کی طرف چلی گئی اور فیروز گل وہیں بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ پھر پیغام بھیجے۔ لیکن ایک تو ملک کا دستور ابھی اس بات کی اجازت نہ دیتا۔ دوسرے لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے کا بھی خیال تھا۔ فیروز گل نے کئی ایک بار سمتی سے پرانی رسم و راہ تازہ کرنی چاہی لیکن

یاسمن سے اب کچھ کہنا سُننا پتھر سے کہنا سُننا تھا۔ ایک مہینہ دو مہینے تین مہینے گذر گئے۔ فیروزگل کی چھٹی ختم ہوگئی اس نے استعفا بھیجدیا۔ اس عرصے میں اس نے یاسمن کے باپ سے بھی تعلقات بڑھالیے لیکن سمی کو رام نہ کرسکا۔ سمی کو کئی روز سے تپ آتا تھا۔ پھر کھانسی بھی آنے لگی۔ گاؤں میں حکیم یا طبیب کہاں تین چار مہینے میں مرض نے اتنا زور پکڑا کہ گھر والے بے آس ہوگئے دیکھنے والے اُسے کوئی دم کا مہمان سمجھتے تھے۔ سمی چارپائی پر پڑی ہر وقت دروازے کی طرف دیکھتی رہتی تیماردار اُس کے مُنہ میں کسی کسی وقت دودھ ٹپکاتے رہتے۔ آس پاس کی بوڑھی عورتیں بھی رات پاس آبیٹھتیں۔ ایک روز رات کا وقت تھا۔ آج سمی کی حالت بہت خراب تھی۔ فیروزگل بھی وہاں موجود تھا۔ سمی جس کوٹھری میں تھی اس میں چراغ جل رہا تھا چراغ کی ہلکی ہلکی روشنی میں بھی سمی کا چہرہ چمکتا نظر آرہا تھا اچانک دروازہ کھلا اور ایک نوجوان آدمی اندر آیا۔ یہ عزیزگل تھا۔۔۔۔۔۔

"عزیزگل؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں! عزیزگل"۔ قلندر نے جواب دیا "وہی دُبلا پتلا عزیزگل"۔

"لیکن اسے تو فیروزگل نے قتل کردیا تھا" میں نے کہا۔

"سنو حکیم!" قلندر بولا "عزیزگل سمی کی چارپائی کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ اُسے دیکھتے ہی سمی ذرا مُسکرائی۔ اور دونوں ہاتھ اس کیطرف بڑھائے عزیزگل اس کی چارپائی کے پاس دوزانو ہوکر بیٹھ گیا اور جھک کر اس کی پیشانی

چوم لی۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور چراغ گل ہوگیا۔ اس اندھیرے ہی میں وہ دوسری دنیا کو چل دی لیکن معلوم ہوتا کہ سو رہی ہے لیکن ابدی نیند۔

"اور عزیز گل؟" میں نے پوچھا۔

"اُسی کا تو اُسے انتظار تھا۔ قلندر نے کہا۔ "لینے آیا تھا لے گیا۔"

"کسی نے جاتے بھی تو دیکھا ہوگا" میں نے پوچھا۔

"آتے تو سبھی نے دیکھا تھا" قلندر نے جواب دیا۔ "لیکن اندھیرے میں جاتے کسی نے نہیں دیکھا۔ گھر والے تو رو پیٹ رہے تھے۔ فیروز گل وہاں سے نکلکر چشمہ کیطرف جہاں وہ اکثر سمی سے ملا کرتا تھا ہولیا۔ اُس کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل رہے تھے لیکن جب وہ چشمہ پر پہنچا تو اس نے جو کچھ دیکھا حکیم! شاید تم مانو گے نہیں۔"

"کیا دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"حکیم" قلندر بولا۔ "عزیز گل اور یاسمن دونوں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ایک پتھر پر بیٹھے تھے۔ فیروز گل کو دیکھکر دونوں نے ایک قہقہہ لگایا اور اُچھلتے کودتے اناروں کے پیڑوں کی طرف چلے گئے۔"

اتنا بیان کرنے کے بعد قلندر نے پھر رباب اُٹھایا اور ایک دلسوز گت بجانے لگا۔

قلندر رباب بجا رہا تھا۔ اور میں پاس خاموش بیٹھا تھا۔ آخر میں نے

پوچھا۔

"یاسمن کے مرنے کے بعد فیروز گل نے بھی شادی کر لی ہوگی۔"

"نہیں!" قلندر بولا۔ "محبوب کے مرنے کے بعد کس سے شادی کرتا اس نے تو گاؤں ہی چھوڑ دیا۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اب گاؤں میں اس کے لئے رکھا ہی کیا تھا۔" قلندر نے جواب دیا۔

"پھر جہاں رقیب ہو وہاں کون رہنا پسند کرتا ہے۔"

"رقیب کو تو اس نے قتل کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "پھر رقیب کا کیا ذکر؟"

"سنو حکیم!" قلندر بولا۔ "اچھا ہوتا جو فیروز گل قصاص میں مارا جاتا۔ کم از کم اس عذاب سے تو چھوٹ جاتا۔"

"عذاب کیسا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ عذاب کیا کم ہے۔" قلندر بولا۔ "کہ عزیز گل اور یاسمن عموماً اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"مردے بھی کبھی کسی کا مذاق اڑایا کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "سٹھیا گئے تم سائیں۔"

"ہم جھوٹ نہیں کہتا!" قلندر بولا۔ "ہر جمعہ کے روز وہ کہیں نہ کہیں فیروز گل کو نظر آتے ہیں اور اسے دیکھ دیکھ کر قہقہے لگاتے ہیں۔"

"جمعہ کے دن میں کیا خصوصیت ہے۔" میں نے پوچھا

"وہ جمعہ کا ہی تو دن تھا۔ جب فیروز گل نے عزیز گل کو قتل کیا۔" قلندر نے جواب دیا۔

"آج بھی تو جمعہ ہی ہے۔" میں نے ہنسکر کہا۔ "لیکن نہ جانے فیروز گل کہاں ہوگا اسوقت"

"دن کہاں گذرا۔" قلندر نے کہا۔ "ابھی تو سورج غروب ہی ہوا ہے۔" اتنا کہکر وہ پھر رباب بجانے لگا۔

شفق کی سُرخی جنگل اور کہسار پر مسلط ہو چکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کی ہر چیز پر حنا لگا رکھی ہے۔ اِدھر اُدھر کسانوں کی کھیتیاں تھیں، میدان تھے۔ اور میدانوں کے عقب میں پہاڑ تھے۔ اور پہاڑوں کے عقب میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ رات کے سکوت کی کیفیتیں ابھی سے پیدا ہو رہی تھیں۔ پیڑوں پر خواب کا ہلکا ہلکا سا رنگ پھیل رہا تھا۔ بوڑھا قلندر ایک عالم بیخودی میں رباب بجا رہا تھا۔ اور کبھی ہولے ہولے ؎

شب غم کے کیسے سناؤں ستم!
تمہاری قسم!
بہت یاد آئے ہو تم! تمہاری قسم!!

گنگنا تے لگتا۔

اچانک دریا کی جانب سے کسی کے قہقہوں کی آواز آئی۔ قلندر

اور میں دونوں دیکھنے لگے۔ دریا کے اُس پار ایک دُبلا پتلا مرد اور ایک حسین عورت ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہنس رہے تھے۔ بوڑھا قلندر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"یاسمن! گذشتہ پچاس سال سے تم نے میری زندگی حرام کر رکھی ہے لیکن سمتی! میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ اب تحمل کی مجھ میں تاب نہیں"

یہ کہہ کر بوڑھے قلندر نے دریا میں چھلانگ ماری۔ اور موجوں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا میں خوف اور حیرت سے بت کی طرح خاموش کھڑا تھا کہ اچانک پھر قہقہوں کی آواز آئی اور وہی مرد اور وہی خوبصورت عورت ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اچھلتے کودتے جنگل کی طرف جاتے نظر آئے۔ اور میری دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دشت و جبل پر تاریکی پھیل چکی تھی اور کوہسار کی خاموشی انسان کی بے مائگی کا الم انگیز افسانہ سُنا رہی تھی بوڑھے قلندر کا رباب زمین پر پڑا ہوا تھا میں نے رباب اُٹھا لیا۔ اور گاؤں کی راہ لی۔ جب درختوں میں ہوا سنکتی تو یہی معلوم ہوتا کہ غم کی دیوی ستار بجا رہی ہے۔

16499

انجام

انجام

آپ جانئے! شکار کی لت بھی بہت بُری لت ہے۔ میری بدقسمتی سمجھئے یا خوش قسمتی۔ ایک مدّت سے میں بھی اس مرض میں مبتلا ہوں۔ سیر و سیاحت کا تو مطلق مجھے شوق نہیں لیکن شکار کے لئے اگر کالے کوسوں کا بھی سفر ہو تو پرواہ نہیں۔ اور اسی شوق کی خاطر دو چار بار تو ایسی کٹھن جھیلنی پڑی کہ اگر کوئی اور ہوتا تو شکار کے نام پر ہی ہزار بار لعنت بھیجتا لیکن اپنی تو یہ حالت ہے کہ ع

یہ وہ نشے نہیں جنھیں ترشی اُتار دے

سردی کا موسم تھا اور کوہستانی علاقہ۔ اور سردی بھی وہ کڑاکے کی

سردی کہ تو بہ ہی بھلی۔ گاؤں والوں کا خیال تھا کہ جب برف پڑنے لگے گی تو جاڑے کی شدت بھی کم ہو جائے گی۔ گاؤں سے کوئی دو چار فرلانگ پر جنگل والوں کی کوٹھی تھی میں اسی کوٹھی میں مقیم تھا۔ کوٹھی کا چوکیدار دونوں وقت کھانا تیار کر دیتا تھا۔ آٹھوں پہر انگیٹھی میں آگ جلتی رہتی اور میں آگ تاپتا رہتا دوسرے تیسرے شکار کو جاتا۔ یہی چوکیدار جس کا نام شبانا تھا میرا راہبر بھی تھا۔ آٹھ آنے یومیہ پر دو چار زمیندار ساتھ ہو لیتے۔ میں کبھی تو شام تک واپس ڈیرے پر آجاتا اور کبھی رات بھی کہیں باہر ہی بسر ہوتی۔ شکار کافی ملتا تھا۔ ریچھ تو عام تھے۔ بارہ سنگا کم ملتا تھا۔ لیکن چیتے بھی کافی تھے۔ مگر ان کا مارنا کچھ آسان نہ تھا۔ انسان کی بُو پاتے ہی کوسوں دُور نکل جاتے۔

شبانا کی بیوی قدرو بہت حسین عورت تھی۔ بائیس چوبیس سال کے قریب عمر تھی۔ یہ شبانا کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی مرچکی تھی میں نے سُنا تھا کہ وہ بھی بہت حسین تھی۔ اور اُسے شبانا سے محبت بھی بہت تھی۔ شبانا اکثر مجھ سے اُسکا ذکر کیا کرتا تھا۔ عموماً رات کیوقت اس قسم کی باتیں ہوا کرتیں۔ قدرو عموماً دراز سے لگ کر یہ باتیں سنا کرتی۔ اور شاید اسی لئے میاں بیوی میں کچھ کھٹ پٹ سی بھی رہتی۔ شبانا کی پہلی بیوی کا نام زونہ تھا۔ شبانا کی نہ تو زونہ سے کوئی اولاد تھی اور نہ ابھی تک قدرو کے کوئی بال بچہ ہوا تھا۔

ایک روز جو میں دو تین دن باہر رہ کر شکار سے واپس آیا تو قدرو اور شبانا میں آتے ہی ایک جھپٹ سی ہوگئی۔ آج سارا دن قدرو بھی روٹھی روٹھی سی نظر آئی اور شبانا بھی منہ پھلائے پھلائے۔ میں رات کا کھانا کھا کر سیدھا سونے والے کمرے میں چلا گیا۔ شبانا نے یہاں بھی آگ جلا رکھی تھی۔ کمرہ خاصہ گرم تھا۔ میرے پیچھے ہی شبانا بھی آگیا اور بولا۔

"سرکار ابھی سے سونے لگے!"

"بھئی!" میں نے کہا۔ "آج بہت تھک گیا ہوں۔"

"آج تو شاید برف پڑے گی۔" شبانا نے کہا۔

"تم نے کیسے جانا؟" میں نے پوچھا۔

"آسمان بالکل صاف ہے۔" شبانا نے جواب دیا۔

"برف پڑتے دیکھنے کو تو میرا بھی جی چاہتا ہے۔" میں نے کہا

"تو دیکھ لیجئے گا آج۔" شبانا نے کہا۔

"مجھے تو نیند آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کہیں تو جگا دوں۔" شبانا نے پوچھا۔

"ضرور!" میں نے کہا۔

اسوقت برآمدے میں سے کسی کے گدگدانے کی آواز آئی۔

"یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"قدرو ہوگی جناب!" شبانا نے جواب دیا۔

"آج تم سے ناراض کیوں ہوگئی"۔ میں نے پوچھا۔

"آج کیا!" شبانا بولا۔ "یہ تو روز کی بات ہے جناب!"

"لیکن کچھ وجہ بھی"۔ میں نے پوچھا۔

"زونہ کے نام سے چڑ ہے اُسے"۔ شبانا نے جواب دیا۔

"لیکن وہ غریب تو مر چکی"۔ میں نے کہا۔

"مرنے سے کیا ہوتا ہے جناب!" شبانا نے کہا۔ "محبت تو نہیں مر جاتی"۔

"بہت محبت تھی تمہیں اُس سے"۔ میں نے پوچھا۔

"جناب!" شبانا بولا۔ "دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اسے بھی تو مجھ سے محبت تھی"۔

"قدرو کو بھی تو تم سے محبت ہے"۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"مصیبت بھی تو یہی ہے جناب!" شبانا بولا۔ "اسی لئے تو وہ زونہ غریب کے نام سے چڑتی ہے"۔

"کیا ہوا تھا زونہ کو"۔ میں نے پوچھا۔

"مر گئی بیچاری!" شبانا نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"بیمار تھی کچھ"۔ میں نے پوچھا۔

"چاقو مار لیا"۔ شبانا نے جواب دیا۔

"ارے!" میں نے چونک کر کہا۔ "خودکشی کر لی۔؟"

"ہاں جناب!" شبانا نے جواب دیا۔ "حرام موت مری"۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے چھری چھین کیوں نہ لی۔"

"محبت کی جلن نے مار ڈالا غریب کو۔" شبانا نے جواب دیا۔ "اسی قدرو کے سر چڑھی۔"

"تمہیں قدرو سے محبت ہوگی۔" میں نے کہا۔ "زونہ غریب تمہاری بے وفائی کی تاب نہ لا سکی۔"

"خدا کی قسم!" شبانا بولا۔ "میں نے زونہ سے کبھی بیوفائی نہیں کی۔ بس محض شک تھا اُسے۔"

قدرو بھی تمہارے پاس ہی رہتی تھی۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب!" شبانا نے جواب دیا۔ قدرو گاؤں میں رہتی تھی۔ اس کا باپ صاحب لوگوں کو شکار کے لئے ساتھ لیجایا کرتا تھا۔ ایک روز ایک زخمی ریچھ کے قابو آگیا اور زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔ قدرو کی ماں رشتہ میں میری خالہ تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد کوئی اُس کی خبر گیری کرنیوالا نہ تھا میں اسے بھی یہاں لے آیا۔ قدرو بنگلے کے کام میں میرا ہاتھ بٹانے لگی آپ نے دیکھا نہیں کبھی بہت ہنس مکھ تھی مجھ سے بھی ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی۔ زونہ کو یہ ناگوار گذرتا۔ وہ مجھ سے بھی ناراض رہتی۔ اور قدرو کو بھی بُرا بھلا کہا کرتی۔ کبھی میں بھی اُسے چڑانے کو کہدیا کرتا کہ مجھے زیادہ تنگ کروگی تو میں قدرو سے شادی کرلونگا۔ وہ بہت بگڑتی۔"

سردی کا موسم تھا اور غالباً یہی مہینہ۔ رات کا وقت تھا۔ کوئی صاحب

بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے میں چوکیداری کرتا تھا۔ کہ اتنے میں قدرو روتی ہوئی آئی۔ آج بھی زونہ نے اُسے بُرا بھلا کہا تھا۔ قدرو روتی تھی میں اُسے تسلی دیتا تھا۔ برف پڑ رہی تھی چونکہ صاحب کے جاگنے کا ڈر تھا ہم دونوں برآمدے سے نکلکر چنار کے نیچے آ بیٹھے۔ میں ایک ٹہنی توڑ کر چاقو سے اس کی چھڑی بنانے لگا۔ اور ساتھ ساتھ قدرو کو بھی سمجھانے لگا۔ اتنے میں زونہ بھی گھر کی طرف سے آئی۔ قدرو اُسے دیکھ کر کچھ سہم سی گئی۔ میں نے کہا کہ ڈرو نہیں میں زونہ کو بھی سمجھا دوں گا۔ زونہ ہم سے کچھ فاصلہ پر آکر کھڑی ہو گئی۔ اور بولی۔

"قدرو! میں کسی روز تمہارے سر چڑھ کر مروں گی"۔

یہ سُنکر قدرو کو بھی غصہ آگیا۔ اُس نے میرے ہاتھ سے چاقو چھین کر زونہ کی طرف پھینکا اور کہا۔

"یہ لو چاقو! دیکھوں تو کیسے مرتی ہو تم۔ آئی بڑی غیرت والی"۔

زونہ نے چاقو اُٹھا لیا اور بولی۔

"قدرو! جس طرح آج تو نے مجھے مرنے کے لئے چاقو دیا ہے کسی روز تو بھی اسی چاقو سے اپنے آپ کو ہلاک کرے گی۔ یاد رکھ تو بھی کل نہ پائیگی"۔

یہ کہنے کے ساتھ ہی اُس نے سینے میں چاقو گھونپ لیا اور تڑپ تڑپ کر مر گئی۔

اس وقت پھر کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ میں نے کہا۔

"قدرو آئی ہو گی"۔

"نہیں جناب!" شبانا بولا۔ "آئی نہیں بلکہ کھڑی سُن رہی تھی۔ اب واپس گئی۔"

تھوڑی دیر بعد شبانا چلا گیا لیکن زوزنہ کی موت کی داستان سنکر میری نیند اُچاٹ ہو گئی

شاید کوئی گیارہ کا وقت ہوگا کہ شبانا نے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چوکیدار جناب!"

"کیا ہے؟"

"برف دیکھیے گا جناب!"

"برف پڑ رہی ہے۔"

"ہاں جناب!"

میں ڈریسنگ گون پہنکر نکلا۔ بہت دلفریب چاندنی تھی۔ اور اس چاندنی میں برف اس طرح گر رہی تھی جیسے دُھنکی ہوئی روئی۔ کچھ دیر تو میں برآمدے میں ہی کھڑا رہا۔ پھر کوٹھی کے دالان میں ٹہلنے لگا۔ پھر گرتی برف ہتھیلی پر لی۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھ پر دُھنکی ہوئی روئی گر رہی ہے۔ اور لطف یہ کہ سردی بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ چوکیدار برآمدے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

"سو گئے کیا؟" میں نے آواز دی۔

"کیا حکم ہے جناب؟"

"یہ برف کھانے میں کچھ حرج تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کی مرضی!"

میں نے تھوڑی برف کھالی کچھ خاص ذائقہ نہ تھا۔

تھوڑی دیر میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ پھر آکر سو رہا۔ صبح جب بیدار ہوا۔ تو ہر چیز برف پوش نظر آرہی تھی۔ درختوں پر بھی برف۔ پہاڑوں پر بھی برف کوٹھی کی چھت پر بھی برف اور میدانوں میں بھی برف۔ مگر ہوا چلنے کے باعث سردی بھی جوبن پر تھی اور برف بھی سخت ہوگئی تھی۔ شبانا کو آج کہیں سرکاری کام پر جانا تھا۔ وہ صبح صبح ہی چلا گیا۔ قدرو چائے لائی میں چائے پینے لگا وہ آگ تاپنے لگی

"قدرو!" میں نے پوچھا۔ "آج چپ کیوں ہو؟"

"ایسے ہی جناب!"

"کچھ تو ہے؟"

"نہیں جناب!" قدرو نے جلتی ہوئی لکڑیوں کو اوپر نیچے کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تم شبانا سے کیوں لڑتی رہتی ہو"

"نصیب ہی ایسے ہیں۔" قدرو نے جواب دیا۔

"تمہارے یا شبانا کے؟" میں نے ہنسکر پوچھا۔

"جو کچھ بھی آپ سمجھ لیں۔"

"آخر جھگڑا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چھوڑیئے اس قصے کو آپ" قدرو بولی"۔ آپ یہ بتلائیے مُردے زندہ بھی ہو جاتے ہیں کبھی۔"

"حشر کے روز سبھی زندہ ہو جائیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"حشر کی بات رہنے دیجئے" قدرو بولی" میں پوچھتی ہوں مُردے قبروں سے بھی کبھی نکل آتے ہیں کیا؟"

"میں نے تو کبھی دیکھا نہیں۔" میں نے کہا۔" کہیں زودنہ کو تو نہیں دیکھا تم نے؟"

"مر کر بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔" قدرو نے لکڑی کو پھر اوپر نیچے کرتے ہوئے کہا۔

"خواب میں نظر آتی ہے کیا؟" میں نے پوچھا

"سوتے جاگتے۔" قدرو نے جواب دیا۔" کسی وقت پیچھا چھوڑتی ہی نہیں۔" یہ سنکر مجھے ہنسی آگئی۔ قدرو بولی۔

"آپ جھوٹ سمجھتے ہیں۔"

"کچھ وہم کا علاج کرو قدرو۔" میں نے کہا۔

"وہم نہیں جناب!" قدرو بولی"۔ رات آپ سے شبانا کیا کہہ رہا تھا؟"

"زودنہ کی موت کا ذکر کر رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔" تم بھی تو کھڑی سُن

رہی تھیں۔"

"ہاں!" قدرو بولی۔ "سُن تو رہی تھی۔"

"اس سے حاصل؟" میں نے پوچھا۔ "جس بات سے اُسے چڑ ہے وہ تم کیوں کرتی ہو۔"

"جس بات سے مجھے چڑ ہے وہ کیوں کرتا ہے" قدرو نے جواب دیا۔

"اُسے زونہ یاد آتی ہے" میں نے جواب دیا۔ "مجبور ہے غریب۔"

"آپ کو زونہ کے الفاظ یاد ہیں" قدرو بولی۔ "وہی جو اس نے مرنے سے پہلے مجھ سے کہے تھے۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"رت شبانا جو آپ سے کہہ رہا تھا" قدرو نے کہا۔

"کچھ یاد نہیں رہا" میں نے جواب دیا۔ "لیکن تم نے اُس کی طرف چاقو کیوں پھینکا؟"

"جل کر" قدرو بولی۔ "پھر مجھے یہ اُمید بھی تو نہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو ہلاک کرے گی۔ میں تو آج تک اُس دن کو پچھتا رہی ہوں۔ نہ جانے میرا کیا حشر ہو۔"

"زیادہ وہم مت کیا کرو۔" میں نے کہا۔

"وہم نہیں جناب!" قدرو بولی۔ "میں دن میں کئی کئی بار زونہ کی آواز سُنتی ہوں۔"

"کیا کہتی ہے تم سے؟" میں نے مُسکرا کر پوچھا۔

"وہی جو اُس نے مرتے وقت کہا تھا۔ قدرو نے جواب دیا۔

"کیا کہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

قدرو بولی۔

"جب میں نے اُس کی طرف چاقو پھینکا تو اُس نے چاقو اٹھا کر کہا۔ قدرو! جس طرح آج تم نے مجھے مرنے کے لئے یہ چاقو دیا ہے کسی روز تو بھی اسی چاقو سے اپنے آپ کو ہلاک کرے گی۔"

"کبھی زونہ کو تم نے دیکھا بھی؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی ایک بار!" قدرو بولی۔ "کئی بار دیکھ چکی ہوں۔"

"آج بھی دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"آج تو نہیں۔" قدرو بولی۔ "لیکن کل رات یہاں سے لوٹتے ہوئے چنار کے نیچے میں نے اُسے کھڑے ہوئے دیکھا اُس کے ہاتھ میں وہی چاقو تھا۔"

"کچھ کہا بھی تم سے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جناب!" قدرو بولی۔ "وہ مجھے چاقو دکھا کر بولی۔ قدرو! جس طرح تم نے مجھے مرنے کے لئے یہ چاقو دیا تھا۔ اسی طرح جس روز میں نے اپنے آپ کو اس سے ہلاک کیا تھا۔ تم بھی اسی چاقو سے اسی روز اپنے آپ کو ہلاک کرو گی۔"

"تم نے کچھ جواب نہ دیا۔" میں نے ہنسکر پوچھا۔

"کیا جواب دیتی۔" قدرو بولی۔ "اتنی بات کہکر وہ کہیں گم ہوگئی۔"

"گم کہاں ہوگئی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اللہ جانے!" قدرو نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا

"زودنہ کو مرے کتنا عرصہ ہوا؟"

"چاند کی چودھویں کو" قدرو نے جواب دیا۔

"کتنا عرصہ ہوا؟" میں نے پوچھا

"بس!" قدرو نے میری طرف کچھ خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "آج سے تیسرے روز اُسے پورا سال ہو جائے گا"

میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ یہ سب اسکا وہم ہے۔ نہ تو مُردے قبروں سے نکلکر کسی کے پاس آتے ہیں نہ باتیں کرتے ہیں لیکن قدرو صرف اتنا کہکر کہ جناب! جو آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا ہو۔ اُس میں شک کوئی کیسے کرے۔ برتن اُٹھا کرلے گئی۔

اِس گفتگو کے دو دن بعد شبّانا برآمدے میں بیٹھا میری بندوق صاف کر رہا تھا۔ اور میں کرسی پر بیٹھا قصہ "چہار درویش" پڑھ رہا تھا۔ شبّانا یہ کتاب کہیں سے اُٹھا لایا تھا۔ یہ کتاب میں پہلے بھی کئی بار پڑھ چکا تھا۔ چاروں درویشوں کی یہ سرگزشت لکھنے والے نے کچھ ایسے دلچسپ پیرایہ میں لکھی ہے کہ جب بھی پڑھو نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بھی اکثر لکھنے والے رومان لکھتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ آج کل کا رومان قصہ چہار درویش کی گرد کو بھی نہیں

پہنچتا۔ شبانا جب بندوق صاف کر چکا تو اس نے چمڑے کی تھیلی سے ایک شکاری چاقو نکالا۔ بالکل زنگ آلود تھا۔ میں نے کہا۔

"اسے صاف کیوں نہیں کرتے۔ کتنا زنگ لگ رہا ہے۔"

"یہ زنگ نہیں جناب!" شبانا نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "یہ زونہ غریب کا خون ہے۔"

"خون؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں! خون!" شبانا نے چاقو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم نے آج تک چاقو صاف کیوں نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"جناب!" شبانا نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "اس خون سے مجھے زونہ کی خوشبو آتی ہے۔"

"تو اسے نکال کیوں لائے؟" میں نے پوچھا۔

"جناب!" شبانا بولا۔ "آج زونہ کو مرے پورا ایک سال ہو گیا۔"

"آج مری تھی۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں جناب!" شبانا نے کہا۔ "آج رات یہی مہینہ تھا اور یہی موسم۔ چاند کی چودھویں برف پڑ رہی تھی اور زونہ نے اس چنار کے پاس اس چاقو سے اپنے خون سے کھیل کر دکھا دی۔"

"آج بھی تو شاید چاند کی چودھویں ہو گی۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں!" شبانا نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "چودھویں۔"

اتنے میں قدرو سامنے سے آتی نظر آئی۔ شبانا نے چاقو تھیلی میں ڈال لیا۔ چودھویں کا چاند قلۂ کوہ پر اپنی جلوہ ریزیاں دکھا رہا تھا۔ شجر و حجر دریائے نور میں نہائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ آسمان سے زمین تک نور کی ردا پھیلی

ہوئی تھی۔ ایک طرف درختوں سے چاندنی چھن رہی تھی۔ دوسری جانب کوہسار اپنے دامن میں چاند کے پھول لئے کھڑا تھا۔ آس پاس جو برف پڑی ہوئی تھی اُسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ کسی صراف نے چاندی کے ڈھیر لگا رکھے ہیں۔ یاسمن کے پھول کسی حسینہ کی آرسی کی طرح چمک رہے تھے نیلے نیلے آسمان پر تاروں کی چمک دیکھ کر سلیمانؑ کے تخت کا دھوکا ہوتا تھا جس کے لئے جنات سات سمندر سے جواہرات اکٹھے کر کے لائے تھے۔

ہوا بالکل بند تھی۔ برف پڑ رہی تھی اور کائنات کے لب پر مہر سکوت لگی تھی۔ میں کھانا کھا چکا تھا اور برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ قدر و برتن اُٹھا کر لے جا چکی تھی۔ اور شبانا ایک طرف بیٹھا اپنے وطن کا کوئی گیت گا رہا تھا۔ اس خاموشی میں اس کی ہلکی ہلکی آواز کسی دُکھے ہوئے دل کی فریاد معلوم ہوتی تھی۔

"کیا گا رہے ہو شبانا؟" میں نے پوچھا۔

"ایسے ہی جناب!" شبانا نے جواب دیا۔ "آج زونہ بہت یاد آ رہی ہے"

"اللہ کو یاد کرو۔" میں نے کہا۔ "اللہ کی یاد سے دل کو تسکین ملتی ہے"

"سچ ہے جناب!" شبانا نے جواب دیا۔

میں برآمدے سے نکل کر یاسمن کے پودوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یاسمن کی نازک نازک شاخوں پر برف پڑی ہوئی تھی۔ میں جب ٹہنی کو ہلاتا تو برف پھولوں کی طرح نیچے گر جاتی۔ شبانا برآمدے سے اُٹھ کر چنار کے درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ اُس کے گانے کی آواز فاصلہ سے کانوں کو کچھ بھلی معلوم ہونے لگی

اتنے میں نوکر گھروں کی طرف سے قدرو بھی آگئی۔ میرے پاس سے جو گذری تو بولی
"کہاں گیا آپ کا چوکیدار؟"
"وہ بیٹھا ہے۔" میں نے چنار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
وہ بھی چنار کی طرف چلی گئی۔ میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اتنے میں دونوں کی آواز آنے لگی۔ قدرو کہہ رہی تھی۔
"اتنی ہی پیاری تھی تو اُس کی قبر بھی یہیں بنا لیتے۔ اور نوکری چھوڑ کر مجاوری کرتے۔ آدھی رات گئی اور تم یہاں بیٹھے ہو۔ گویا صبح کوئی کام ہی نہیں۔"
"تم الجھتی کیوں ہو۔" شبانا نے کہا۔ "میرے کام کی تمہیں کیوں فکر ہے۔"
"تم یہاں بیٹھ کیوں رہے۔" قدرو نے پوچھا۔
شبانا بولا
"زونہ یاد آتی ہے۔ آج اُسے پورا ایک سال دنیا کو چھوڑے ہو گیا۔ یاد ہے تمہیں یہی وقت تھا نا!"
قدرو نے بگڑ کر کہا۔
"جانے میری بیزار"
شبانا نے ہتھیلی سے چاقو نکالا اور کہا۔
"دیکھو ابھی تک اُس غریب کا خون لگا ہے۔"
قدرو بولی

"چاٹ کیوں نہیں لیتے"

یہ کہتے ہوئے قدرو نے شبانا کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا۔

شبانا طنزاً ہنسکر بولا۔

"تم بھی اسے اپنا خون پلاؤ گی"

"قدرو نے کہا۔

"اگر تم اسی طرح مجھے جلاتے رہو گے"

شبانا بولا۔

"میں تو کسی کو جلاتا نہیں اور جو کوئی خود ہی جلے تو اس کا میرے پاس علاج نہیں"

قدرو نے جواب دیا

"ابھی جلانا باقی ہے۔ دن رات اُسی کٹنی کا تمہاری زبان پر نام رہتا ہے"

شبانا بولا

"اُس غریب کو کیوں گالی دیتی ہو۔ اُس کے نام سے تمہیں پتنگے کیوں لگ جاتے ہیں"

قدرو بولی۔

"کٹنی مرکر بھی تو پیچھا نہیں چھوڑتی"

میں درختوں کے نیچے ٹہل بھی رہا تھا اور اُن دونوں کی باتیں بھی سُن رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے شبانا جو اُٹھا تو قدرو نے پوچھا۔

"اب کہاں چلے؟"

"شبانا نے جواب دیا۔

"ذرا زونہ کی قبر پہ جاؤں گا"

قدرو نے اُسکا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا

"کیوں؟"

شبانا نے کہا۔

"ایسے ہی"

قدرو بولی

"گھر چلو"

لیکن ساتھ ہی قدرو کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی میں نے پلٹ کر جو دیکھا تو درخت سے دو چار قدم کے فاصلے پر ایک اور عورت کھڑی تھی۔ سچ جانئے! اُس عورت کو دیکھنے کے ساتھ ہی میرے رونگھٹے کھڑے ہو گئے۔

"زونہ!" دونوں کے مُنہ سے نکلا۔

پھر زونہ نے ہاتھ اُٹھا کر کچھ اشارہ کیا۔ شبانا قدرو سے ہاتھ چھڑا کر زونہ کی طرف چلا۔ اُسوقت وہ میرے اور قدرو کے درمیان تھا۔ ساتھ ہی ایک قہقہے کی آواز آئی اور قہقہہ کے ساتھ ہی قدرو اپنے خون میں تڑپتی نظر آئی۔ اور شبانا نے سر پیٹ کر کہا۔

"میرے اللہ! یہ بھی گئی۔"

میں نے جلدی سے پاس جاکر پوچھا۔

"یہ کیا ہوا؟"

"آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔" شبانا نے روتے ہوئے کہا۔ "پھوٹی میری تقدیر!"

"یہ دوسری عورت کون تھی؟" میں نے پوچھا۔

"خدا ہی جانے۔" شبانا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر جواب دیا۔

سچ ہے! ع

خدا کی باتیں خدا ہی جانے!!

16499

عورت کا منتر

عورت کا منتر

(۱)

جناب محترم!
تسلیم و نیاز!

آپ نے ملاقات کا موقع دیا۔ اس عنایت بے نہایت کے لئے بندی کا شکریہ قبول فرمائیں۔ واقعی آپ کی صاف گوئی قابل داد ہے۔ اور آپ کا یہ طعن کہ ؎

اب تو برباد ئے گلشن کا ذرا خوف نہیں
برق رہتی ہے ہمیشہ مرے کاشانے میں

بالکل بجا۔ لیکن اگر جان کی امان پاؤں تو اتنا عرض میں بھی کروں کہ بجلی سے شناسائی پیدا کرنے کے لئے دل چاہئے۔ میں بجلی ہی سہی لیکن جسے "برق نوازیوں" کی تاب نہ ہو وہ بجلی سے کھیلے کیوں۔ آگ کا کام ہے جلانا۔ اور جو آگ سے کھیلے گا کسی روز جلے گا بھی۔ کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے مجھے طعن و تشنیع کے سوا کوئی لفظ آپ کی زبان سے نکل ہی نہ سکا۔

آپ کا دوست! فرشتہ! ایک مکمل انسان! ایک مخلص دوست! چراغ لیکر بھی ڈھونڈوں تو حشر تک ایسا "پاکباز" نہ پاؤں۔ کیا کہوں! آمنّا وصدّقنا؟ لیکن میں کون؟ "دامن میں بجلیاں چھپائے ہوئے"۔ سبحان اللہ! اب میں کیا عرض کروں ؎

ماضی پہ میں جب نگاہ کر لیتا ہوں
حالت غم سے تباہ کر لیتا ہوں
کچھ اور تو دسترس نہیں ہے لیکن
ہر سانس پہ ایک آہ کر لیتا ہوں

اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کر سکتی۔

رحم کی طالب
"اقبال"

(۲)

بی اقبال!

تسلیم!

عنایت نامہ غیر متوقع طور پر ملا۔ گویا آپ چاہتی ہیں کہ کچھ مزید گفتگو کی راہ پیدا ہو جائے۔ بہت اچھا صاحب! ع

سر تسلیم خم ہے جو مزاج دوست میں آئے

جب کسی چیز پر بحث چھڑ جائے تو زبان کی درشتگی کا گلہ کیسا؟ میرے دوست کی عزت کا سوال ہے۔ اور ہم دونوں میں اختلاف رائے! میں کہتا ہوں میرا دوست واقعی ایک فرشتہ سیرت آدمی ہے۔ اور آپ کا حسن! کیا کہوں چاند کا جواب! آپ حسن کی دوکان سجا کر بیٹھتی تھیں وہ بھی کبھی کبھی آپ کو دیکھا کرتا تھا دو ایک بار آپ کے مکان پر گانا سننے بھی چلا گیا۔ اس کے پاس دولت تھی آپ کے پاس حسن! قصہ ختم! یا اس پر بھی کچھ مزید بحث کی ضرورت ہے اُسے جب دیکھو آپ کا ثنا خوان کسی موضوع پر بات کرو لیکن اس کی زبان پر اقبال کا نام۔ مگر اسکا نتیجہ؟ آپ کو معلوم ہی ہے۔ اب میں کیا کہوں۔ وہی شخص جس کی دنیا کبھی آپ کے خیال سے آباد تھی اُس کے جاننے والے اکثر اس کی زبان سے سنا کرتے ہیں کہ ؎

سنے جو کوئی فسانہ مری شب غم کا
عذاب حشر بھی خواب خیال ہو جائے

کیوں؟

خیر! اتنا تو آپ نے بھی تسلیم کرلیا کہ آپ آگ ہیں۔ اور جو آگ سے کھیلے گا وہ جلیگا بھی۔ معاف فرمائیے! یہ تو آپ کا یعنی آپ لوگوں کا مسلک ہی ہے۔ اس کا گلہ آپ سے کیسا؟ لیکن یہ تو مشہور مثل ہی کہ سچی بات ہمیشہ کڑوی ہوا کرتی ہے آپکو اشتعال آنا ہی چاہیئے تھا یعنی ؎

مئے صافی ہے اب تو شیخ صاحب

ریاکاری کے دھبّے دھو رہے ہیں

لیکن آتنا عرض کرنے کی مجھے بھی اجازت دیجیے کہ گناہ سے عذر گناہ بدتر ہوتا ہے سال بھر کے تعلقات پر یوں لات مار کر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لینا ہر ایک کا شیوہ نہیں۔

کس چیز کی کمی تھی اس کے یہاں؟ دو چار خدمت گار۔ موٹر۔ کوٹھی۔ اور سب سے زیادہ وہ چیز جو آپ لوگوں کو جان سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے آزادی! یہ سب کچھ ہوتے ہوئے سیاہ و سپید کی آپ مالک۔ اور آپ کی ایک ایک ادا پر ہزار جان قربان کرنیوالا ایک بندۂ بے دام! وہ شخص جس نے مال و دولت کے ساتھ عزت اور آبرو بھی یہ کہکر ؎

مجھے آبرو پہ تھا ناز کچھ وہی لے کے آیا ہوں نذر کو

تو اسی کو آج قبول کر ترے نام کی یہ نیاز ہے

آپ کے قدموں پر نچھاور کردی۔ اس سے آپ نے اس طرح بیگانگی اختیار

کی۔ کہ گویا کبھی کی شناسائی نہ تھی۔ دیکھنے اور سُننے والے کیا کہتے ہونگے۔ مگر آپ کو خدا نے وہ دل ہی عطا نہیں کیا جسے کسی کے کہنے سننے کا احساس ہو احساس اُسے ہوتا ہے جس کے پہلو میں دل ہو۔ پتھر کو کسی کے جذبات یا دکھ درد کی کیا پرواہ! اب اس سے زیادہ اور کیا لکھوں

والسلام

احقر

"نیاز"

(۳)

جناب محترم!

تسلیم!

نادم ہوں کہ گرامی نامہ کا جواب جلد نہ دے سکی۔ سبحان اللہ! بی اقبال! خوب القاب ہے۔ کل تک جسے آپ بھابی کہتے تھے وہ آج پھر "بی" بن گئی۔ شریفوں کے یہ لچھن نہ ہوں تو پھر شریف کون کہے۔ شکریہ!

بحث تو شوق سے کیجیے، لیکن بحث میں فحاشیات پر اُتر آنا کن لوگوں کا شیوہ ہے؟ کسے انکار ہے اس بات سے کہ میں حسن کے اڈے پر عصمت فروشی کی دُوکان سجا کر بیٹھی تھی لیکن جناب نے کبھی یہ بھی آج تک دیکھا ہے

تشنہ لب کے پاس آتا ہی کبھی اُٹھ کر کنواں !!

رخصت کب منزل نے باندھا کارواں کے واسطے

بتلایئے! کبھی میں نے بھی آپ کے فرشتہ سیرت دوست سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ کبھی کسی راہ جاتے کا دامن پکڑتے آپ نے بھی مجھے دیکھا۔ میں تو حسن فروش تھی ہی۔ پھر ایک آبرو باختہ کے مکان پر ایک فرشتہ سیرت انسان کیوں آ دھمکا شاید اس زمانے میں ایسے ہی فرشتے ہوتے ہونگے۔ مجھے اگر جناب کے دوست کی دولت کا لالچ ہوتا تو اپنے اڈے پر بیٹھ کر لوٹتی مجھے کیا بنی تھی جو میں قفس کی چڑیا بن گئی۔ کچھ جواب ہے اسکا آپ کے پاس؟

آپ نے بالکل بجا فرمایا کہ سچی بات ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آپ سچّی بات سننے کے لئے تیار بھی ہیں ؟

میں تو ازل سے ریاکار ہوں۔ ریاکاری میرا پیشہ۔ ریاکاری میری گھٹی میں۔ ریاکاری میرا مذہب! مگر کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ایک فرشتہ سیرت آدمی کا شیوہ کیا ہوتا ہے۔ میں گنہگار۔ جس خاندان میں پیدا ہوئی پل کر جوان ہوئی جوان ہو کر طوطا چشم ہوئی۔ وہ گھرانا بھی گنہ گاروں کا گھرانا لیکن ایسے گھرانے سے راہ و رسم پیدا کرنے والے کون ؟ عذر گناہ کا طعن کیسا ؟ کب عذر کیا میں نے کب کہا میں نے کہ آپ کے دوست کے ہاں مجھے آرام اور آزادی حاصل نہ تھی جناب! سچی بات اگر کڑوی نہ لگے تو کیا میں بھی اتنا عرض کر سکتی ہوں کہ آپ نے وہ خط اس گنہگار کو کیوں لکھا؟ یاد ہے نا ؟ میری آزادی سے فائدہ اُٹھانے کی کس نے کوشش کی۔ کیوں حضرت ؟ کوئی منہ بولی بھابی کو بھی یوں لکھا کرتا ہے کہ ؎

مدد اے اشک رواں ضبط سے گھبراتا ہوں۔
آتش عشق کی گرمی سے پُھکا جاتا ہوں ۔
سوزشِ داغ کی میں تاب نہیں لاتا ہوں۔
ہائے کیا آگ لگی ہے کہ جلا جاتا ہوں۔

سرد ہوتی ہی نہیں اس دلِ زار کی آگ
پھونک دی عشق نے کس شعلۂ رخسار کی آگ

کیوں جناب! اب اگر کوئی آپ کا خط دیکھ پاتا۔ یا مجھ سے "اظہار ہمدردی" کرتے دیکھ لیتا تو فرمایئے! دیکھنے سننے والے کیا کہتے؟ اگر اس گنہگار کے پہلو میں پتھر کا دل نہ ہوتا تو اس روز ..... یاد ہے؟ کہاں یاد ہوگا آپ کو سُننے میں یاد دلاتی ہوں۔ بسنت کے روز کھانے کے وقت آپ نے کاغذ کا ایک پُرزہ جیب سے نکال کر اس کی گولی بنائی اور اپنے مخلص دوست کی نظر بچا کر میری طرف پھینکدیا یاد ہے آپ کو اُس کاغذ پر آپ نے کیا لکھا تھا۔ مجھے یاد ہے سنئے ؎

جو سُنے اُسے بھی خلش رہے جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے!
یہ فسانہ زُلفِ دراز کا کہیں زندگی سے دراز ہے

میری طرف یوں کاغذ پھینکنا آپ کے دوست نے دیکھ لیا تھا اور اُسے ناگوار بھی گذرا۔ اور اُس نے مجھ سے اُس کا ذکر بھی کیا لیکن محض اس لئے کہ ایک شریف آدمی کی عزّت پر حرف نہ آئے۔ اس پتھر کی دل والی نے زبان سے ایک حرف نہ کہا۔ کیوں جناب! دوست کی محبوبہ پر ڈورے ڈالنا کن لوگوں کا شیوہ ہے اجازت ہو تو کچھ اور بھی عرض کروں لیکن اب فرصت نہیں جلی کٹی شوق سے کہیئے۔ مگر ذرا اپنا دامن بھی بچا کر رکھیئے۔

گنہ گار
"اقبال"

(۴)

بائی صاحبہ!

تسلیم!

واقعی! پڑھے ہوئے جن سے کون عہدہ برآ ہو سکتا ہے ہنسی اور دل لگی کی باتوں کو بھی آپ نے اتنی اہمیت دیدی۔ دنیا میں کھیل کی باتیں کھیل کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ بحث تو یہ تھی کہ آپ نے ایک غریب کے ساتھ جو کچھ کیا اچھا نہ کیا اور آپ دوسری راہ پر ہولیں۔ گویا آپ کے دل میں انتقام لینے کی کچھ کاوش پیدا ہو رہی ہے۔ اگر یہی ارادہ ہے تو یہ حربہ بھی استعمال کر دیکھئے۔ لیکن اس سے پہلے اتنا غور بھی کر لیجیے کہ اس داستان پارینہ کو دُہرانے سے سمجھنے والے یہی سمجھینگے کہ آپ پھر صلح کی سلسلہ جنبانی کرنی چاہتی ہیں لیکن معاف فرمائیے۔ ع

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں!

تو خیر! یہ تو آج ہی معلوم ہوا کہ آپ مجھے بھی اپنا گھائل سمجھتی تھیں۔ کیا خوب ہے

شراب جام میں بھر دی کہ زہر ساقی نے
کسے دماغ ہے اتنا کہ امتیاز کرے

میری اور اپنی بحث کو الگ ہی رہنے دیجیے۔ میں نے تو صرف اتنا عرض کیا تھا کہ آخر کون سی آپ پر ایسی کڑی پڑی جو آپ نے علیحدگی اختیار کر لی۔ مجھے تو

وہ دن یاد ہیں جب آپ کا زانو ہوتا تھا اور میرے دوست کا سر۔ جو وہ کہیں نظر سے اوجھل ہوا تو آپ بیتاب! اور جو تم کہیں گھومنے گھامنے چلی گئیں تو وہ بیقرار! مگر اب آپ سے پوچھنا ہی کیا۔ آپ نے خود ہی لکھ دیا کہ اب آپ کو فرصت کم ہوتی ہے۔ جی ہاں! کوئی پرانے ملنے والے آگئے ہوں گے۔ یا کوئی نیا شکار پھنسایا جا رہا ہوگا۔ سچ ہے ؎

ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا
زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا

اور آپ کی مجبوریاں۔ ارے معاذ اللہ! چلتا ہوا کاروبار اگر بند ہو جائے تو اسکا از سر نو جاری کرنا واقعی ایک مشکل کام ہے۔

انسان تو خطا کا پتلا ہے۔ اس سے بھول نہ ہو تو کس سے ہو لیکن جہاں عورت کا سوال ہو عورت جرأت دلائے تو مرد خطا کار بنتا ہے۔ بس اس موضوع پر اس سے زیادہ کچھ عرض نہ کروں گا۔ اور نہ اس بحث میں دوبارہ پڑنے کی مجھے ضرورت ہے۔ اور اگر آپ اس کی وجہ بھی معلوم کرنی چاہیں تو جہاں آنے جانے کی کسی کو ممانعت نہیں وہاں حجاب کیسا؟ یہ باتیں تو آپ کے عشرت کدہ پر بھی ہو سکتی ہیں۔

بہرکیف میں خوش ہوں کہ ع
تیرے سینے میں ہے کچھ کاوش ایام ابھی

لیکن افسوس تو صرف یہ ہے کہ ؎

تو کیا جانے کہ سودائے محبت کسکو کہتے ہیں
محبت اور محبت کی لطافت کس کو کہتے ہیں
غمِ ہجراں ہو کیا اور سوزِ اُلفت کس کو کہتے ہیں
جُنوں ہوتا ہے کیسا اور وحشت کس کو کہتے ہیں
تو کیا جانے غمِ شبہائے فرقت کس کو کہتے ہیں
ترے اظہارِ اُلفت کی فصاحت رات بھر کی ہے
خود ہی انصاف فرمایئے! کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے۔

نیازمند
"نیاز"

(۵)

جناب محترم!

تسلیم!

اب جب آپ نے یہ مان لیا کہ میں ایک پڑھا ہوا جن ہوں تو پھر مجھے بھی کچھ صاف صاف عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔

یہ تو مجھے پہلے ہی توقع تھی کہ آپ سے میرے خط کا جواب نہ بن آئیگا۔ بس وہی آئیں بائیں شائیں۔ حضرت یہ بغلیں کیوں جھانکنے لگے آپ! کسی بات کا جواب تو دیا ہوتا۔

معاف فرمائیے! بھابی سے عشقبازی کے خیال سے شاید آپ "آب آب" ہو رہے ہوں گے۔ اینٹ کا جواب اگر پتھر سے دیا جائے تو معاملہ جلد ختم ہو جاتا ہے۔

جانے! آپ کس خیال میں ہیں۔ جو "بی" یا "بائی" ہو وہ صلح کی سلسلہ جنبانی کرنے میں پہل نہیں کیا کرتی۔ پہل صرف "شریف" لوگ کرتے ہیں۔ ناک رگڑتے ہیں تو شریف۔ ہاتھ جوڑتے ہیں تو شریف۔ ہمارے یہاں تو یہ دستور ہے کہ ع

تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی!

آپ ایسے مہربان سلامت ہیں تو کاروبار کا چل نکلنا کوئی بڑی بات نہیں۔ باقی رہا کسی پر لانے سے رسم و راہ تازہ کرنا تو یہ کوئی جرم نہیں۔ پھنسنے والے خود پھنسنے چلے آتے ہیں لیکن جنہیں آنکھ ملانے کی جرأت نہ ہو وہ صرف کاغذ کے گھوڑے ہی دوڑایا کرتے ہیں۔

کوئی بحث چھیڑ کر یوں بند کر دینا اپنی کم مائگی کی دلیل ہوتی ہے۔ آپ نے مرد اور عورت کی بحث شروع کی اور صرف اتنا فرما کر کہ "عورت جُرأت دلائے ہی تو مرد خطا کار بنتا ہے"۔ ایک پُر لطف مضمون کو جانے کیوں نا تمام چھوڑ دیا۔ حالانکہ یہ تو وہ مضمون ہے کہ ؎

پھولوں کے دل ہیں شرح محبت سے چاک چاک
کلیوں کے لب ہیں حرف تمنا لئے ہوئے

دل چاہتا ہے وہ ہاتھ چوم لوں جس ہاتھ نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ عورت جرأت دلاتی ہے تو مرد خطا کار بنتا ہے۔ اور مرد بھی وہ جو شرافت کا پتلا ہو۔ ٹھیک ہے نا جناب! اور اگر آپ یہ فرما دیتے کہ مرد ہزار حیلوں ہزار بہانوں سے ایک غریب اور ناتواں عورت کو رام کر کے مطلب نکالنے کے بعد اُس سے الگ ہو جاتا ہے تو کچھ مضائقہ تھا کیا لیکن اس قسم کی جُرأت صرف شریف لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔

لُچّوں شہدوں کا تو نام ہی بدنام ہے۔ فرشتہ بن کر شیطان کا روپ دھارنا صرف مرد کا ہی کمال ہے جنّت کے بہلاوے پر جہنم میں جھونک دینا صرف مردوں کا ہی شیوہ ہے۔ سبز باغ دکھلا کر مبتلائے عذاب کرنا صرف مردوں کو ہی زیبا ہے۔

پہلے عورت کو محبت کے یہ میٹھے بول سنانا کہ ؎

جانِ تمنا جلد آجاؤ دل کو نہ اب بے تیر تڑپاؤ

نغمۂ شیریں اپنا سناؤ

آؤ آؤ! پیاری آؤ!

جلوۂ ہوش رُبا دکھلاؤ

اور جب یہ سب کچھ ہو جائے۔ تو پھر ؎

جب نہیں مستوریوں میں بھی گناہوں سے نجات

دل کھلے بندوں غریقِ بحرِ عصیاں کیوں نہو

کی صدا آنے لگتی ہے۔ کیوں جناب! کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے۔ لیکن آپ تو اپنے دوست کے نام پر مجھ سے بات چیت کر رہے تھے۔ یہ بیچ میں اپنا دُکھڑا کیوں لے بیٹھے۔ وکیل کا کام ہے کہ اپنے موکل کی وکالت کرے۔ یہ نہیں کہ اِدھر اُدھر کی باتوں سے مقدمہ خراب کر دے۔ آپ نے دعویٰ دائر کیا اور میں نے جواب دعویٰ بھی پیش کر دیا لیکن دوست کی محبوبہ پر ڈورے [illegible] لنے کا اور بھابی سے یہ کہنے کا کہ ع

یہ فسانۂ زلف دراز کا کہیں زندگی سی دراز ہے

آپ سے تو کچھ جواب بن نہ آیا۔ بندی نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ ذرا دامن بچا کر رکھیئے۔ خیر! اچھا ہوا کہ بحث نے اپنا رُخ بدل لیا ورنہ ممکن تھا کہ ملزمہ کا بیان آپ کے لئے اور بھی باعثِ تکلیف ہوتا۔

جی ہاں! میں نے کسی سے دل لگایا ہو تو یہ بھی جانوں کہ ع

غمِ شبہائے فرقت کسکو کہتے ہیں

باقی رہا یہ کہ ع

ترے اظہارِ الفت کی فصاحت رات بھر کی ہے

تو شاید آپ بھی اسی کے لیئے ترس رہے ہیں۔ خدا رحم فرمائے آپ پر!

ہاں! آپ کا یہ ارشاد بالکل دُرست کہ میرا نانو ہوتا تھا اور آپ کے دوست کا سر۔ اور یہ بھی بالکل بجا کہ وہ پاس نہ ہوتے تو مین بیکل ہو جاتی۔ اور جو یہ گنہگار کہیں اِدھر اُدھر چلی جاتی تو وہ بیتاب۔ ان باتوں کے ہوتے ساتے میرا یوں اُن سے الگ ہو جانا بظاہر میری جبلی بے وفائی اور ریاکارانہ سرشت پر دال ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کی تو اُن سے مدت کی ملاقات تھی۔ آپ ان کے رازداں بھی تھے اور صلاح کار بھی۔ آپ نے اُن سے ہی پوچھ لیا ہوتا۔ آپ مجھ سے مت پوچھئے۔ کیوں؟ جناب! میں چاہوں تو ع

وہ بات کہدوں کہ پتھر دل کے جگر کو بھی آب آب کر دے!

اب رہا میرا عشرت کدہ! تو غرض یہ ہے کہ غریب خانہ میں تو آپ جیسے شرفا کے دم قدم سے ہی رونق رہتی ہے یہ تو سچ ہے کہ جب اور جسوقت کسی کا دل چاہے چلا آئے لیکن ذرا اس سے خبردار رہے کہ بسا اوقات اکثر واپس جانیوالے یہ کہتے بھی سُنائی دیئے ہیں کہ ع

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے!

گنہ گار "اقبال"

(۶)

اقبال بائی!

تسلیم!

سچ ہی کیوں نہ کہدوں۔ تمنا تھی کہ خط کا جواب جلد آئے شکر کہ یہ تمنا پوری ہوگئی۔ کیوں جناب کیسی بگڑیں آپ! اسے کہتے ہیں مرد کا کمال! ہوگئیں نا آپ تو آپ بھی قائل۔ پڑھے ہوئے انسان اور پڑھے ہوئے جن میں (خاص کر جبکہ وہ جن عورت ذات ہو۔) یہی ایک فرق ہوتا ہے۔ کہ وہ الفاظ کے ہیر پھیر میں اُلجھ کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے

بیشک! میں کچھ اکرام کے متعلق ہی آپ سے کہہ رہا تھا۔ مجھے اب بھی افسوس ہے کہ جو برتاؤ آپ نے اکرام کے ساتھ کیا وہ اسکا ہرگز مستحق نہ تھا۔ اکرام کو آپ سے محبت تھی۔ وہ محبت جو ایک عورت کی دنیا بدل دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ دو چار ملاقاتوں کا نتیجہ یہ نہیں نکلا کرتا جو اکرام اور آپ کی ملاقاتوں کا نکلا۔

دونوں کی طبیعت میں ایک جوہر کامل موجود تھا۔ یہ سب اس کے کرشمے تھے کہ ایک ملکۂ حسن مشہور مغنیہ جس کے میٹھے ترانوں سے شاید شجر و حجر بھی وجد میں آجاتے ہوں۔ ایک دنیا پر لات مار کر صرف ایک کی ہوگئی۔ اور مجھے تعجب بھی یہی ہے کہ آخر ہوا کیا۔ جو ایک بلبل رنگین نوا ایک خوبصورت

چمن زار چھوڑ کر پھر نخاس پہ آ بیٹھی۔ بس یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بادل جس سے موتی برستے تھے طوفان کیسے بن گیا۔ وہ چمن جس کی مہک سے ہر راہگذر کا دل و دماغ معطّر ہوتا تھا اُس پر اتنی جلدی خزاں کیوں آگئی۔ بیشک ؎

—— میں نے مانا کہ مرا کام ہے دشوار مگر!
تجھ کو مشکل نہیں مشکل مری آساں کرنا

والسلام

طالب عفو
"نیاز"

(۷)

جناب!

تسلیم!

یہ آپ کس رو میں بہنے لگے۔ جلی کٹی کہہ چکے کیا۔ یا میں یہ سمجھوں کہ ؎

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

اچھا ہوا کہ آپ نے خود ہی اپنے دوست کا نام بھی بتلا دیا۔ شکریہ! آپ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں اکرام صاحب سے ہی پوچھ لیں شکر ہے کہ میں "بی" سے "بائی" اور "بائی" سے اقبال بائی تو ہو گئی۔

بندی
"اقبال"

(۸)

اقبال !

تسلیم و نیاز

اکرام سے پوچھنا ہوتا تو آپ سے کیوں کہتا۔ معاف فرمائیے ! اتنی عقلمند ہونے پر بھی آپ یہ نہ سمجھ سکیں کہ وہ بات جو اکرام نے مجھ سے چھپائے رکھی اس سے کیسے پوچھتا۔

لیکن اب اکرام ہے کہاں ؟ یہ سُنکر غالباً آپ کو بھی افسوس ہوگا کہ آج آٹھ روز ہوئے وہ ریل گاڑی کے حادثہ میں اس دنیا سے چل بسا۔ کتنا اچھا دوست تھا۔ خدا کی قسم ! آپ کا تو وہ اکثر ذکر کیا کرتا تھا۔ افسوس ! میت کو کندھا دینا بھی نصیب نہ ہوا۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا !

نیاز مند

"نیاز"

(۹)

جناب نیاز!

تسلیم!

اوئی میرے اللہ! یہ تو آپ نے بہت بُری خبر سنائی۔ ہائے ہائے! اکرام اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ خدا اکرام کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے کتنی خوبیوں کا انسان تھا طبیعت میں انکسار۔ آنکھ میں لحاظ۔ دوستوں سے تلطف سے ملنا۔ اور دشمنوں سے مدارات۔ ہائے توبہ! ابھی تو اکرام کے مرنے کے دن نہ تھے۔ اچھا ع

خدا اکرام کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

مگر جناب! اگر میں اس کے ساتھ یہ بھی کہدوں کہ اچھا ہوا جو اکرام غم ایام سے چھوٹ گیا تو آپ کو کچھ نہ کچھ تعجب تو ضرور ہوگا لیکن اکرام ہی کی پیاری روح کی قسم! اکرام کی موت اس کے حق میں آپ ایک رحمت ہی سمجھئے۔ گو ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں!

اب گڑے مُردے اُکھیڑنے سے کیا حاصل!

بندی

"اقبال"

شام کا وقت تھا۔ اور سردی کے موسم کی ابتدا۔ اقبال باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ چولھے پر ہنڈیا چڑھی ہوئی تھی۔ ایک مراسی ایک طرف بیٹھا آٹا گوندھ رہا تھا۔ باورچی خانے کے بغل میں سیڑھیاں تھیں اقبال بیٹھی بیٹھی کچھ گنگنا رہی تھی۔ میراسی لے بتلا رہا تھا۔ اور اقبال اس کی نقل کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن آواز گلے سے ٹھیک نہ نکلتی

"کیا کروں!" اقبال بولی۔ "گلا ٹھیک ہوتا ہی نہیں۔"

"گلے کی کیا بات ہے" میراسی نے جواب دیا۔ "چار دن میاں اکرام کا گھر تو تم نے لبا لیا۔ نہ جانے تم عورتوں کو کیا مار ہوتی ہے کہ اچھا کماتیں اچھا کھاتیں پہنتیں اُٹھ بھاگتی ہو۔ کچھ عزت ہے اس میں بھی کیا؟"

اقبال نے ایک آہ بھری اور کہا۔

"اکرام تو اللہ میاں کو پیارا بھی ہو چکا۔ اب اس غریب کا ذکر ہی کیا؟"

"کب!" میراسی نے اقبال کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آٹھ دس روز ہو گئے"۔ اقبال بولی۔ "وہ جو گاڑی کی ٹکر ہوئی تھی نا۔ اُسی میں شہید ہوا غریب۔"

"تم نے کس سے سُنا؟" میراسی نے پوچھا

"نیاز سے"۔ اقبال نے جواب دیا۔

"وہی جو اکرام کے دوست ہیں"۔ میراسی نے آٹا گوندھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" اقبال نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"نیاز بھی تو کچھ برا آدمی نہیں"۔ میراسی نے کہا۔ "چلو چھوڑو! رونے کیا بیٹھیں تم"۔

اتنے میں کسی کے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز آئی۔

"کون ہے؟" میراسی نے بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

"اجازت ہے؟" سیڑھیوں کی جانب سے کسی نے پوچھا۔

"دیکھو تو کون ہے"۔ اقبال نے دوپٹہ سنبھالتے ہوئے کہا۔

میراسی نے اُٹھ کر دیکھا تو نیاز کھڑا تھا۔

"تشریف لائیے"۔ میراسی نے بیٹھنے کے کمرے کا دروازہ جو سیڑھیوں کے ساتھ ہی تھا کھولتے ہوئے کہا۔

نیاز اندر جا بیٹھا۔

"آپ تشریف رکھئے"۔ میراسی بولا۔ "میں بی بی کو بھیجتا ہوں"۔

"کون ہے؟" جب میراسی واپس آیا تو اقبال نے پوچھا۔

"نیاز ہے"۔ میراسی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کون نیاز؟" اقبال نے تعجب سے میراسی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میاں اکرام کے دوست"۔ میراسی نے جواب دیا۔ "جاؤ جلدی اکیلا بیٹھا ہے"۔

پھر ہنسکر۔

"بس وہ منتر پڑھو کہ شکار پھنس ہی جائے"۔

"اقبال نے دوپٹے کی دوہری بکل ماری اور باورچی خانے سے اُٹھ کر بیٹھنے والے کمرے میں چلی گئی۔

اُسے دیکھتے ہی نیاز تعظیم کے لئے اُٹھا۔

"توبہ! توبہ!" اقبال بولی۔ "تشریف رکھئے۔ گنہگار کو اور بھی گنہگار کرتے ہیں آپ۔"

"مزاج اچھے ہیں؟" نیاز نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"شکر ہے۔" اقبال بولی۔ "جی رہی ہوں۔"

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر نیاز نے کہا۔

"اگر آپ ناراض ہیں تو میں چلا جاؤں"

"آپ کی مرضی۔" اقبال نے جواب دیا۔ "ہم گنہگاروں کے گھر نہ کوئی پوچھ کر آتا ہے۔ نہ پوچھکر جاتا ہے۔"

نیاز نے مسکرا کر کہا۔ ع

"تیرے سینے میں ہے کچھ کاوشِ ایام ابھی"

اور اقبال نے جواب دیا۔

"ہونی ہوئی نا!"

نیاز صوفے پر بیٹھا تھا اور اقبال فرش پر بیٹھی تھی۔ نیاز نے اقبال کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"یہاں آ بیٹھئے۔"

اقبال نے نیاز کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بھابی کو پاس بٹھاتے شرم تو نہ آئے گی"

نیاز نے مسکرا کر ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا۔ "کہیں وہ بات ہی نہ ہو کہ بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے"

"جیسی نیت ویسی مراد" اقبال نے سر ہلا کر کہا

"اقبال!" نیاز بولا۔ "خدا کے لئے اب چھوڑ دو بھی یہ باتیں"

"تو کیا" اقبال بولی۔ "ریاکاری کی باتیں کروں۔ اچھا فرمایئے۔ مزاج تو اچھے ہیں۔ دھن بھاگ جو آج آپ بھی ادھر بھول پڑے۔ بندی یاد کیسے آگئی۔ راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں۔ چائے پیجئے گا یا شربت منگواؤں؟ ..... یا گانا ....."

"اقبال!" نیاز بات کاٹ کر بولا۔ "تمہاری زبان سے یہ باتیں کچھ زیب نہیں دیتیں"

"تو پھر آپ ہی دو چار ملاحیاں اور سنا دیجئے" اقبال نے جواب دیا۔

"استغفراللہ!" نیاز نے کہا۔ "میں تو محض معافی مانگنے حاضر ہوا ہوں"

"طوائف سے" اقبال نے پوچھا۔ "جس کا پیشہ حسن فروشی ہے جس کا ایمان پیسہ ہے؟"

"اقبال سے!" نیاز نے جواب دیا۔

"پرانی رسم و راہ تازہ کرنی چاہتے ہیں؟" اقبال نے پوچھا۔

"ہاں جناب!" نیاز بولا "اب آ جو گئے۔ جو دل میں آئے کہہ لیجئے!"

یہ کہکر نیاز نے ایک آہ بھری اور کہا ؎

دل ہی تو ہے نا آخر پتھر کا یا ہے ٹکڑا
ترکش میں تیر تھے جو سب آپنے وہ مار ے
اب اور بھی لگا لو باقی رہا ہو کوئی!
حسرت سی رہ نہ جائے سینے میں کچھ تمہارے

اقبال بولی۔

"یہ آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ یا اپنا ارادہ ظاہر فرما رہے ہیں"

"سننے والوں سے" نیاز نے جواب دیا۔

"یعنی دوست کی محبوبہ سے؟" اقبال نے پوچھا۔

"دوست اب کہاں؟" نیاز نے ایک آہ بھر کر کہا

"کیا ہوا انہیں؟" اقبال نے پوچھا۔

نیاز نے اکرام کے ریل گاڑی کی ٹکر میں مارے جانے کا واقعہ سنایا اسپر اکرام کا ذکر کچھ دیر ہوتا رہا اور اقبال کے دو چار بار آنسو بھی نکلے لیکن تان اس پر ٹوٹی کہ

"دوست کی دغا بازی دیکھ کر غریب کا دل ٹوٹ گیا ہوگا"

"دغا بازی؟" نیاز نے پوچھا "کیسی؟"

"دوست کی محبوبہ پر ڈورے ڈالنے کی" اقبال نے ذرا زیر لب مسکراتے

ہوئے کہا" کاغذ کی گولیاں بنا کر پھینکنے کی۔ منہ بولی بھابی سے اظہار محبت کرنے کی۔ طوائف کو ملکۂ حسن کہنے کی۔"

نیاز نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ اقبال نیاز کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

" اب چپ کیوں سادھ لی آپ نے ؟ کچھ کہئے تو سہی"

" اقبال!" نیاز نے کہا" معاف کر دو"

اور اقبال نے ہنس کر کہا۔ ع

" ستم ہے آدمی کیواسطے مجبور ہو جانا !

ٹھیک ہے نا جناب !"

" جو چاہو کہہ لو" نیاز نے جواب دیا۔

اور اقبال نے پھر ہنس کر کہا" شاید تشریف آوری کی وجہ یہ ہو گی کہ ع

ترے اظہار الفت کی فصاحت رات بھر کی ہو ۔ آپکو تفسیر معلوم کرنی ہو گی"

نیاز نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ اقبال بولی۔

" یہ تو ایک گنہ گار کا گھر ہے مسجد تو نہیں جو آپ اذان دینے لگے"

" معاف نہ کرو گی اقبال"؟ نیاز نے پوچھا۔

" آج آپ تشریف کیسے لے آئے" اقبال نے پوچھا" کہاں ایک بیسوا کا گھر اور کہاں ایک زاہد پاکباز"

" معافی مانگنے" نیاز نے جواب دیا۔

" کس سے؟" اقبال نے پوچھا" بی صاحبہ سے یا بائی صاحبہ سے"

"اقبال سے!" نیاز نے اسکا خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "کہدیجئے معاف کیا۔"

"ہرگز نہیں" اقبال نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اب ناک رگڑواؤ گی" نیاز نے پوچھا

"طوائف کے کوٹھے پر شریف ناک رگڑا ہی کرتے ہیں" اقبال نے جوابدیا۔

"خدا کی قسم!" نیاز بولا "آجتک کسی نے اتنا ذلیل نہ کیا تھا"

اقبال ہنسکر بولی۔ ع

تجھ کو مشکل نہیں مشکل میری آساں کرنا

"سچ جانو!" نیاز نے پھر کہا "بس یہی چیز یہاں کھینچ لائی ہے۔"

"تو گویا" اقبال بولی "آپ صرف یہ معلوم کرنے آئے کہ میں نے میاں اکرام کو چھوڑ کیوں دیا؟"

"جی نہیں!" نیاز نے جواب دیا "اب چونکہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں اس لئے بقول آپ کے اب گڑے مُردے اکھیڑنے سے کیا حاصل! ممکن تھا کہ میں یہاں آنے کی جرأت نہ کرتا لیکن آپنے یہ لکھکر کہ اچھا ہوا جو اس نے دنیا کے تفکرات سے جلدی چھٹکارا پالیا مجھے عجیب تذبذب میں ڈالدیا۔ جہاں تک مجھے اکرام مرحوم کے حالات معلوم ہیں میں کہہ سکتا ہوں کہ اُس کی زندگی قابل رشک تھی۔ اور وہ بڑی خوبیوں کا آدمی تھا فکر اور غم تو میں نے گذشتہ بارہ چودہ سال میں اس کے پاس بھی پھٹکتے نہیں دیکھا۔ اور اسے فکر ہو بھی کیا سکتا

تھا۔ نہ کسی کا قرضدار! نہ کسی کا اُپسر احسان! اچھی خاصی صحت اور دولت کی فراوانی اور پھر ایک حسین عورت پہلو....."

یہ کہتے ہوئے نیاز کو ہنسی آگئی۔ اقبال بولی

"یاد ہے آپ کو میں نے ایک خط میں آپ کو لکھا تھا کہ۔ ع

وہ بات کہدوں جو پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کردے"

"ہاں! نیاز نے جواب دیا۔" یاد تو ہے"۔

"تو پھر کہدوں؟" اقبال نے پوچھا۔

"اسی لئے تو حاضر ہوا ہوں"۔ نیاز نے کہا" اسی کی خاطر تو ذلیل ہو رہا ہوں"۔

"نیاز صاحب!" اقبال بولی" آپ کا دوست قاتل تھا"۔

اقبال اور نیاز جس کمرے میں بیٹھے تھے۔ وہ اقبال کے مذاق کے مطابق خاصا سجا ہوا تھا لیکن اُسوقت اس کمرے کا سکوت بہت روح فرسا معلوم ہوتا تھا۔ اقبال فرش پر گاؤ تکیہ سے پیٹھ لگائے بیٹھی تھی اور نیاز اس کے پاس ہی صوفے پر لیکن یہ خوفناک الفاظ سُنکر کہ اکرام قاتل تھا۔ نیاز کو ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ اس کمرے کی ہر چیز اسے بھیانک نظر آرہی تھی حتیٰ کہ اقبال جسے اکرام کی زندگی ہی میں وہ شوق کی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا اسوقت وہ اُسے بھی کچھ خوفزدہ نگاہوں

سے دیکھ رہا تھا۔

"قاتل!" آخر وہ خوف سے لرزتی ہوئی آواز سے بولا "کیا کہا آپ نے استغفراللہ! توبہ توبہ! اکرام۔ قاتل!"

"جی ہاں!" اقبال نے جواب دیا "قاتل"

"آپ سے کس نے کہا؟" نیاز نے پوچھا "کس سے سُنا آپ نے؟"

"مقتول نے" اقبال نے جواب دیا۔ "اور اس کی تائید خود اکرام نے کی"

"اقبال! نیاز بولا "کیا کہہ رہی ہو"

"وہی جو آپ معلوم کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں" اقبال نے ذرا آنکھیں مٹکا کر جواب دیا۔

نیاز نے ایک لمبا سانس لیا اور بولا۔

"اقبال! تم ایک تجربہ کار عورت ہو میری کمزوریاں بھی تمہیں معلوم ہیں۔ اور شاید ..... لیکن اسوقت اس کا موقع نہیں لیکن ....."

"اور شاید!" اقبال بولی "آپ کی مجھ پر کچھ نظر عنایت بھی تھی۔ یہی مطلب ہے نا آپ کا؟"

"لیکن!" نیاز بولا "جو کچھ تم کہہ رہی ہو۔ اُسے باور کر لینے کو دل نہیں مانتا"

"مجھ سے بھی اگر کوئی دوسرا کہتا تو شاید مجھے بھی یقین نہ آتا" اقبال نے جواب دیا۔

"اکرام اور قاتل!" نیاز بولا۔ اور ....."

"اور" اقبال نے بات کاٹ کر کہا۔ "قاتل بھی بیوی کا۔"

"استغفر اللہ!" بے اختیار نیاز کے منہ سے نکلا۔

"استغفر اللہ کہئے"۔ اقبال نے کہا۔ "یا لاحول پڑھئے لیکن جو کچھ آپ پوچھنا چاہتے تھے آپ نے سن لیا ہے۔"

کمرے میں اب بالکل اندھیرا ہو چکا تھا۔ اقبال نے اٹھ کر بجلی کا بلب روشن کر دیا۔ میراسی نے آکر کہا کہ کھانا تیار ہے۔ اقبال نے نیاز سے پوچھا۔

"کھانا منگواؤں؟"

"بس شکریہ!" نیاز نے جواب دیا۔

میراسی بولا۔

"کچھ ہرج ہے کیا۔ کھا لیجئے۔ یہ بھی تو آپ ہی کا گھر ہے۔"

"بھوک نہیں اسوقت!" نیاز نے جو خیالات کے بحرِ عمیق میں شناوری کرتا معلوم ہوتا تھا جواب دیا۔

"کچھ گانا وانا سنئے گا۔" میراسی نے پھر کہا

"پھر کسی وقت۔" نیاز نے جواب دیا۔

"آپ جانئے۔" کہہ کر میراسی چلا گیا۔

"اقبال!" میراسی کے جانے کے بعد نیاز بولا۔ "خدا کے لئے بتلاؤ

تو یہی آخر یہ ماجرا کیا ہے؟"

"اوہو!" اقبال ہنسکر بولی۔ "آپ واسطے کیوں دینے لگے۔ آپ کو جانے کی جلدی ہوگی؟"

"مجھے کہیں جانا نہیں"۔ نیاز نے کہا۔ "جب تک بٹھائے رکھو گی بیٹھا رہوں گا لیکن پہلے یہ بتلاؤ کہ آخر یہ راز کیا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ اکرام نے شادی کبھی کی ہی نہیں۔

"نیاز صاحب!" اقبال بولی۔ "یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ اکرام کی گاؤں میں بہت سی زمینداری ہے۔ اور انہی اراضیات کی آمدنی پر وہ اس ٹھاٹھ باٹھ سے رہتا تھا۔ اکرام کے بچپن میں ہی والدین مر چکے تھے۔ جائداد کورٹ آف وارڈ میں تھی۔ کیونکہ اور کوئی قریبی رشتہ دار نہ تھا۔ تعلیم پانے تک وہ شہر میں رہا۔ پھر جب جائداد واگذار ہوئی تو اُس نے شہر میں کوٹھی بھی بنالی۔ لیکن سردیوں کے موسم میں وہ عموماً کچھ روز کے لئے اراضیات پر چلا جایا کرتا تھا۔ گاؤں میں بھی اُس نے ایک خوبصورت مکان بنوا رکھا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی گاؤں کی ایک لڑکی سے اُس کی شناسائی تھی۔ یہ اُسی کے ایک مزارعہ کی بیٹی تھی اور خاصی قبول صورت تھی۔ اکرام نے لڑکی کے والدین سے بالا بالا ہی قاضی کو ساتھ ملا کر اُس سے نکاح کر لیا۔ لیکن جب جائداد قبضے میں آئی اور دولت کی فراوانی سے اکرام کی آنکھیں کھُلیں تو وہ زنجیر جو اُس نے ناتجربہ کاری

سے پاؤں میں ڈال رکھی تھی اب بہت تکلیف دہ معلوم ہونے لگی لیکن اکرام اب گاؤں چھوڑ کر شہر میں آرہا۔ اور لڑکی کے والدین کا روپے کی جھنکار سے مُنہ بند کر دیا۔ وہ تو چپ ہو رہے لیکن مصیبت یہ آپڑی کہ اکرام کی بیوی کو اُس سے بہت محبت تھی اس لئے وہ اُسے اکثر گاؤں آنے پر مجبور کیا کرتی اور جب اکرام گاؤں میں آتا تو وہ بھی اس کے پاس اس نئے مکان میں آجاتی لیکن ایک روز جو وہ آئی تو پھر وہاں سے نکلنے کے کسی نے نہیں دیکھا۔"

"مار ڈالا اکرام نے اُسے" نیاز نے پوچھا

"ہاں!" اقبال نے جواب دیا "مار ڈالا"

"لیکن آپ سے کس نے کہا؟" نیاز نے پوچھا۔

"خود اکرام نے" اقبال نے جواب دیا۔

"اکرام نے؟" نیاز نے تعجب سے پوچھا "خود اپنے جرم کا اقبال کر لیا تم سے؟"

اقبال بولی۔

"کون زبان سے اقبال کرتا ہے۔ لیکن یہ تو شاید آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ اکرام سوتے میں بہت بڑبڑایا کرتا تھا کبھی گا رہا ہے کبھی ہنس رہا ہے لیکن کبھی کچھ ایسے خوفناک الفاظ بھی اُس کے مُنہ سے نکل جاتے کہ میں چونک پڑتی۔ اور کبھی کبھی وہ خود بھی مجھ سے پوچھا کرتا کہ

اقبال! میں سوتے میں کچھ واہی تباہی تو نہیں بکا کرتا۔ اور میں ہنسکر چپ ہو رہتی لیکن یہ مرض تو اچانک زیادہ ہی ترقی کر گیا۔ میں اکثر ان کے منہ سے کچھ اس طرح کے الفاظ سنا کرتی۔

"کسی طرح مانو گی بھی؟"

"میرا پیچھا بھی چھوڑو گی؟"

"کون اعتبار کرے گا تمہاری بات کا؟"

"ماں باپ کی ناک کٹواؤ گی کیا؟"

"نہیں مانتی!"

"کیوں؟ اب بھی بولو! بولو! بولو!"

"خون! خون!"

"کیا مر گئی۔ نہیں! خون!"

ایک روز خون خون کہتے ہوئے وہ پلنگ سے کود کر دروازے کی طرف بھاگا لیکن میں نے جلدی سے پکڑ لیا۔

"اے توبہ ہے!" اکرام مسکرا کر کہا۔ "بہت بھیانک خواب دیکھا میں نے؟"

"کیا دیکھا آپ نے؟" میں نے پوچھا۔ اکرام بولا۔ میں نے کسی کو قتل کر دیا ہے۔ استغفر اللہ! بہت بھیانک خواب تھا۔ تم تو سو رہی ہو گی۔" میں نے کہا کہ نہیں میں جاگ رہی تھی۔ "جاگ رہی تھیں تم کہتے

ہوئے اکرام نے زور سے میرا ہاتھ دبایا اور بولے کہ کیا کہہ رہا تھا میں؟ آپ یقین جانئے کہ اکرام نے جن نگاہوں سے اُسوقت میری طرف دیکھا میں تو کچھ ڈر گئی۔ اور وہ بھی ہنسنے لگا۔ اور بات رفت گذشت ہوگئی لیکن مجھے کچھ یقین سا ہو چلا کہ اکرام نے ضرور کوئی ایسا کام کیا ہے جس سے وہ خائف رہتا ہے۔ جب اراضیات کا محاصل وصول کرنے کا وقت آیا تو ہم دونوں گاؤں میں آگئے لیکن یہاں آکر مرض کا کچھ زیادہ ہی دورہ پڑنے لگا اور وہ اکثر سوتے میں "خون! خون!" ارے یہ کیا کر دیا میں نے!" بولو، بولو! کیا مر گئی! اس کے منہ سے نکلا کرتا۔ ایک روز وہ مجھ سے کہنے لگا کہ اقبال! جب میں ہی تباہی بجنے لگوں تو تم جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا کرو۔ میں نے پوچھا کہ آخر تمہیں یہ ہو کیا گیا ہے کہ بس "خون" "خون" کے سوا تمہاری زبان سے کچھ اور نکلتا ہی نہیں کہیں کسی کو مار تو نہیں دیا تم نے۔ وہ ہنسکر کہنے لگا کہ مارا تو نہیں لیکن کسی کو مارتے دیکھا ضرور ہے۔ میرا ایک نوکر تھا۔ اس نے اپنی محبوبہ کو مار دیا۔ میں نے کہا کہ تم نے کیوں نہ روکا۔ اس نے جواب دیا کہ میرے روکنے سے پیشتر ہی اس نے اس کے سینے میں چاقو بھونک دیا تھا۔ "کیوں مارا اُسے"۔ میں نے پوچھا۔ "مجھے معلوم نہیں" اکرام نے جواب دیا میں نے کہا۔

"پھر پھانسی تو لگا ہوگا"۔ "نہیں"۔ اکرام نے کہا۔ "پرانا نوکر تھا میں نے بچا لیا۔ پھر ہنسکر کہنے لگا کہ توبہ ہے! نہ جانے انسان کو اسوقت ہو کیا جاتا ہے کہ ایک اپنے ہی جیسے انسان کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ تو جناب اُس

روز مجھے پورا یقین ہو گیا کہ اکرام نے ضرور کسی عورت کو قتل کیا ہے۔ اور اسی روز سے میں اُس سے خائف رہنے لگی۔"

"خائف رہنے والی بات بھی تو تھی۔" نیاز نے کہا۔ "لیکن یہ کب کا قصہ ہے؟"

"کوئی چار مہینے ہو گئے۔" اقبال نے جواب دیا۔ "اور جہاں تک میرا خیال ہے اکرام بھی کچھ مجھ سے خائف ہی رہتا تھا۔ اور ایک روز تو اُسنے اپنے شکوک صاف لفظوں میں کہدیئے۔"

"کیا۔" نیاز نے پوچھا۔ "کیسے شکوک؟"

"ایک روز باتوں باتوں میں اکرام کہنے لگا کہ اقبال! اگر تم کسی وقت مجھ سے ناراض ہو جاؤ تو میری تو شاید جان پر بن جائے۔ اقبال نے جواب دیا۔

"جان پر کیوں بن جائے۔" میں نے پوچھا۔ "مجھ سے بہتر تمہیں ہر وقت مل سکتی ہیں۔"

اکرام ہنسکر کہنے لگا۔

"لیکن تم تو مجھے قتل کے مقدمہ میں ماخوذ کرا سکتی ہو۔"

اب ایک واقعہ سُنئے۔ شام کا وقت تھا اور سردی کا موسم ہم دونوں آتشدان کے سامنے آرام کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میز پر ایک لمپ جل رہا تھا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ہوا کے جھونکے سے لمپ کی بتی جھلملانے لگی۔

"یہ دروازہ کس نے کھول دیا۔" کہتے ہوئے جو میں دروازہ بند کرنے

کو اُٹھی تو ایک نوجوان عورت کو دروازے میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ توبہ ہے میری توبہ! اس عورت کے سینے میں چاقو پیوست تھا اور خون سے اس کی کرتی سُرخ ہو رہی تھی۔ یہ خوفناک منظر دیکھتے ہی میں نے خوف سے چیخ ماردی چیخ کی آواز سُنکر اکرام اُچھل پڑا لیکن اس عورت کو دیکھتے ہی وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ وہ عورت اب آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ پھر اکرام کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی میں دیوار کے ساتھ لگی خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر اکرام کے سامنے کھڑی رہی۔ پھر وہاں سے ہٹ کر میری طرف آئی میں چیخنا چاہتی تھی لیکن دہشت سے زبان حلق میں سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی۔ یہ عورت مجھ سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہوگئی اب اس نے ہاتھ اُٹھا کر چاقو کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اسی ہاتھ سے اکرام کی طرف اشارہ کیا اور چپکے سے باہر نکل گئی۔

ہوا کے جھونکوں سے لیمپ گل ہو چکا تھا اور آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کی ہلکی ہلکی سُرخ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کی ہر چیز خون سے رنگی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اکرام اسی طرح سر جھکائے اور دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپائے خاموش بیٹھا تھا۔ میرے جب حواس ٹھکانے ہوئے تو میں نے آگے بڑھ کر اکرام کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا

"یہ کون تھی؟" "چلی گئی کیا؟" اکرام نے پوچھا۔ میں نے کہا کہ ہاں چلی گئی لیکن یہ تھی کون؟ وہی کمبخت! اکرام نے جواب دیا۔ "کون؟" میں

نے پوچھا۔ "مقتولہ!" اکرام نے جواب دیا۔ پھر خود ہی کہنے لگا۔ توبہ ہے۔ اس کمبخت نے تو میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ کیسے؟ میں نے پوچھا۔ اکرام کہنے لگا کہ ہمیشہ سال کے اسی مہینے میں اور آج ہی کے دن یہ کمبخت مجھے آکر پریشان کیا کرتی ہے۔ کیوں؟ میں نے پوچھا۔ تم سے اُس سے کیا بیر ہے۔ اکرام بولا یہی تو وہ ہے جسے میرے نوکر نے قتل کیا تھا۔ یہ سنتے ہی کہ میں نے جسے دیکھا ہے وہ کوئی بھوت تھا خوف سے میرا خون خشک ہو گیا۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے اکرام نے نوکر کو آواز دی۔ اس نے آکر لمپ روشن کیا جب کھانے پر بیٹھے تو پھر وہی باتیں ہونے لگیں میں نے پوچھا کہ اسے تم سے کیوں بیر ہو گیا اکرام کہنے لگا کہ میری آنکھوں کے سامنے جو قتل کر دی گئی اور میں بچا نہ سکا۔ میں نے پوچھا کہ اس ظالم نے اسے مارا کیوں؟ تو اکرام نے کہا کہ وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور وہ چھوڑتی نہ تھی لیکن پیچھا چھڑاتا کیوں تھا؟ میں نے پوچھا۔ اکرام نے کہا کہ شاید کچھ واقعات ہی ایسے پیدا ہو گئے ہوں گے۔ میں نے کہا تو تم نے نوکر کو بچا کیسے لیا۔ اکرام نے کہا کہ عورت کے والدین کو پانچ سات ہزار دیکر منا لیا میں نے کہا کہ کوئی بڑے ہی سنگدل ماں باپ ہوں گے جو بیٹی کے قتل پر چپ ہو گئے۔ اکرام نے کہا کہ عزت کے لئے انسان سبھی کچھ کرتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ بیٹی کو اس سے ملنے ہی کیوں دیتے تھے۔ اکرام نے کہا کہ اس نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ اور جتنی تنخواہ اسے ملتی تھی بیوی کے والدین کو دے دیتا تھا۔ لیجئے جناب! یہ ہے کل قصہ! دیکھ لیجئے کہ آپ کے

دوست نے اپنے جُرم کا کس طرح اقبال کیا۔ اور مقتولہ نے کس طرح خود مجھے قاتل کا پتہ بتلایا۔ اب اس کے بعد آپ جانتے ہیں کہ میرا اس سے کیسے نباہ ہو سکتا تھا۔"

نیاز کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔

"بڑی خوفناک داستان سُنائی تم نے"

"بہرکیف!" اقبال بولی "اب تو میں گنہ گار نہ سمجھی جاؤں گی"

"ہرگز نہیں!" نیاز نے جواب دیا "میرے خیال میں تمہاری اپنی زندگی بھی خطرے میں تھی"

پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر "اوہو! ساڑھے دس ہونے کو ہیں۔ تمہارا بہت وقت ضائع ہوا"

اقبال بولی۔

"میرے وقت کی فکر مت کیجئے! آپ یہ کہئے کہ یہ کتھا سُنا کر میں نے آپ کا وقت ضائع کر دیا"

پھر مسکرا کر بولی

"شاید! کسی سے ملنے کا وعدہ کر رکھا ہوگا۔ وہاں انتظار ہو رہا ہوگا۔

"خدا کی قسم!" نیاز بولا "مجھے کہیں جانا نہیں"

اس وقت وہی میراسی پھر آیا اور بولا۔

"بی بی! آج روٹی نہیں کھاؤ گی۔ دو ایک گانا سننے والے بھی آکر چلے گئے۔"

"لے آؤ!" اقبال نے کہا۔

جب میراسی چلا گیا تو نیاز بولا۔

"اب مجھے بھی اجازت دیجئے۔"

"اجازت اُس سے لیجئے۔" اقبال نے جواب دیا۔ "جس سے پوچھ کر آپ یہاں آئے ہیں۔"

"یہاں تو دل کھینچ لایا تھا۔" نیاز نے مسکرا کر کہا

"تو بس!" اقبال نے بانکپن سے سر ہلا کر کہا۔ "دل ہی سے پوچھئے!"

"دل تو دیوانہ ہے۔" نیاز نے ہنس کر کہا۔ "کہیں وہی بات نہ ہو کہ ع

بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

"تو کوچے سے نکلنے کو کون کہہ رہا ہے آپ سے؟" اقبال بولی۔ "آپ تو خود ہی بھاگے جاتے ہیں۔"

"آخر سونا بھی تو ہوا۔" نیاز نے کہا۔ "گیارہ بجنے کو ہیں۔"

اور اقبال نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ساتھ کے کمرے میں پلنگ موجود ہے سو رہیئے۔"

اسوقت بازار سے کوئی رنگین مزاج مزے مزے سے یہ گانا گذر رہا تھا۔

ہجر میں اپنا اور ہی عالم ابرِ بہاراں دیدۂ پُرنم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں اُف رے جوانی ہائے زمانے

" سُن لیا آپ نے " نیاز نے اقبال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا سچ کہہ رہا ہے نا "

" اقبال بازار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی " سنئے ! سنئے ! "

گانے والے کی آواز آئی ؎

پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدوں پہ سجدے
جو نہیں جائز اس کی دعائیں اُف رے جوانی ہائے زمانے!

" کیوں جناب !" اقبال نے ہنسکر کہا " سچ کہہ رہا ہے نا ! "

نیاز نے اقبال کا ہاتھ کھینچکر اُسے صوفے پر بٹھا لیا۔ اُسوقت میری کھانا لیکر آیا۔ اور دونوں کو ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھکر بولا۔

" واہ بی بی! خوب پڑھا منتر ! "

دونوں ہنسنے لگے۔

16499

شاہسوار

شاہسوار

جھکی جھکی سی نگاہیں اُس کی وہ سہما سہما حجاب اُس کا
سیاہ آنکھوں میں اُسکے مستی وہ جاگا جاگا شباب اُس کا
گھٹا کے پردے سے ہلکے ہلکے وہ ماہ تاباں کے پیارے جلوے
دکھا رہا تھا وہی نظارے اُٹھا اُٹھا سا نقاب اُس کا
وہ زیر لب اُسکا مسکرانا کلی سی گویا چٹک رہی تھی!
مگر اب اس بزم رنگ و بو میں کہاں ملیگا جواب اسکا

میرے مکان کے سامنے چیری کے دو چار ہرے ہرے پیڑ تھے ان میں پھل آئے ہوئے تھے کسی میں کالے کسی میں سُرخ۔ سبز سبز ٹہنیوں میں

گول گول پھل اس طرح لٹک رہے تھے جیسے کسی حسینہ کے کانوں میں بندے
ایک چھوٹی سی ندی پیڑوں کے پاس سے کسی سرمست نازکی طرح رقص کرتی ہوئی
گذرتی تھی۔ پانی آئینہ کی طرح صاف اور برف کی طرح سرد تھا۔ یہ جوئے سرد و
آفریں" پتھروں کے بستر پر کسی بیقرار حسینہ کی طرح کروٹیں بدلتی سڑک کے ساتھ
ساتھ بہتی ہوئی گاؤں کا طواف کرتی میدانوں میں لہراتی اور بل کھاتی چلی
گئی تھی۔

صفیہ اسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اور انہی پیڑوں میں اس نے جھولا
ڈال رکھا تھا کبھی جو پانی بھرنے آتی تو گھڑا کنارے پر رکھ کر جھولے پر جا بیٹھتی۔
جھولتی اور گاتی۔ گاتی اور جھولتی ؎

سجنوا تم بن چاندنی راتیں!
نیلا امبر نوری تارے چھوٹے چھوٹے پیارے
بالے جوبنوا کو ترسائیں!
سجنوا! تم بن چاندنی راتیں!

صفیہ کو قدرت سے حسن بھی عطا ہوا تو جہاں سوز اور بانکپن بھی ملا تو
دلفریب۔ چاند سا چہرہ۔ سرو قد۔ دو بالہ دار مست آنکھیں۔ رفتار کبک کو شرمائے
اور مئے شباب سے سرشار میں اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھا اُسے
دیکھا کرتا۔ وہ جب جھولے پر بیٹھکر جھولتی تو میرا دل بھی ہچکولے کھانے لگتا

کبھی جو مجھ سے آنکھیں چار ہوتیں تو وہ شرما کر دوسری طرف دیکھنے لگتی اور جو میں دوسری طرف دیکھتا تو وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتی لیکن میں اس کے انداز تکلم سے ابھی تک آشنا نہ ہوا تھا۔

طبیعت کی لاابالیوں نے مجھے وطن سے نکال کر یہاں پردیس میں لا بٹھایا تھا۔ نیا ملک نئے رسم و رواج۔ ہر جگہ ایک اجنبیت سی۔ قدم قدم پر ایک جھجک سی لیکن وقت مزے سے کٹ رہا تھا۔ کتاب خوانی کا شغل۔ کہسار کے دلفریب مناظر چپے چپے پر قدرت کی مشاطگی کے نظارے۔ ایک طرف پہاڑ اور دوسری جانب میدان۔ دریا اور ندی نالے اور قدرت کے وہ پاک نظارے جن کی زیارت سے دل و جان کو تازگی اور فرحت حاصل ہو میرے لئے یہ ایک دنیا نوخیز تھی اور اس دنیا نوخیز میں تصفیہ کے جلوے حور جناں کی یاد دلاتے تھے۔

بستی سے کچھ دور پہاڑوں کے دامن میں جنگل کا راستہ طے کرنے کے بعد ایک چھوٹی سی جھیل تھی اس جھیل کا نام نیل سر تھا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا کہ صانع قدرت نے پہاڑ کے دامن میں بلور کا فرش کر دیا ہے کہنے کو تو پانی کا ایک تختہ لیکن آئینہ سیال کی طرح چمکتا ہوا جس میں جنگل کے نونہال اور کہسار کی چوٹیاں خاموش کھڑی اپنا عکس دیکھتیں اُن ہی پہاڑوں کی ایک چوٹی ثریا سے ہم کلام معلوم ہوتی تھی۔ پیر فلک نے اسے دوسروں سے سرفراز کرنے کیلئے

برف کی دستار اس کے سر پہ باندھ رکھی تھی۔ قدرت کے یہ خاموش نظارے بزم جہاں کی بے ثباتی کی داستان ہر نظارہ پسند کو سُنا رہے تھے میں عموماً گھر سے نکلکر نیل سر کے کنارے آ بیٹھتا۔ وقت کیسے کٹتا اور کیونکر کٹتا۔ یہ نہ مجھے معلوم تھا اور نہ مجھے اس کی پرواہ تھی۔ ہاں! اس بات کا مجھے اقرار ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ ع

تصویر یار آنکھ کی پتلی میں کھنچ گئی!

اور یار بھی وہ جس سے آج تک بات کرنا تو درکنار! آنکھ ملانے کا بھی موقع نہ ملا تھا لیکن اگر یہ سچ ہے کہ دل را بہ دل رہیست! تو جب مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ میرے دل میں اس کی چاہ تھی تو پھر آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ اس جذبہ سے تہیدست وہ بھی نہ ہوگی اور میں اپنے آپ کو یہ کہکر تسلی دیتا کہ میرے نہاں خانۂ دل میں جو اس کی محبت مستور ہے تو اس کے لئے مجھے اسکا منت پذیر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ع

عشق اول در دل معشوق پیدا میشود!

لیکن اسکا کیا کیجئے کہ ع

باتیں ہیں عاشقوں کی دنیا سے نرالی!

نہ جان نہ پہچان اور دل میں رقابت کے سامان ابھی سے موجود نظر آنے لگے گاؤں میں بیسیوں خوشرو جوان تھے۔ کون جانے! اُن میں سے کسی کو صفیہ دل دے بیٹھی ہو۔ اگر کسی کو دل دیا نہ ہوتا تو پھر ع

سجنوا تم بن چاندنی راتیں!

الاپنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ تو کیا میرا نیل سر کے کنارے جا کر بیٹھنے کا باعث کہیں یہی پریشانی تو نہ تھی۔

شام کا وقت تھا اور شفق کے ساحر نے نیل سر اور نیل سر کے گرد و پیش کے مناظر کو سونے کی قبا پہنا کر زرنگار بنا رکھا تھا۔ گائے اور بھیڑوں کا ریوڑ کوہسار کی ڈھلوانوں پر سے اُتر رہا تھا اور گوالا لاٹھی کندھے پر رکھے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ریوڑ بھی صفیہ کے گاؤں کا تھا اور گوالا بھی صفیہ کا ہموطن۔ گائیں گردنیں جھکائے چل رہی تھیں اور بھیڑیں بھائیں بھائیں کرتی آ رہی تھیں اور نوجوان گوالا اپنے وطن کی تانیں اُڑاتا چلا آ رہا تھا۔ اور میں نیل سر کے کنارے ٹانگ پر ٹانگ رکھے خیالوں کی دنیا بسا رہا تھا۔ اور یہ خیال کیا تھے صفیہ کا خیال! یا وطن کی یاد! نہیں، بلکہ دُنیا کی بے ثباتی اور انسان یعنی اپنی بے مائگی پر غور کر رہا تھا۔ لیکن اس نوجوان گوالے کو دیکھ کر خیالات کی ناؤ کسی اور ہی طرف بہنے لگی۔ گوالے کی جوانی، گوالے کی آزادی، اور ان سے زیادہ گوالے کی بیفکری کتنی عجیب تھی۔ اس کی زندگی کی سادہ پرکاریاں کتنی قابلِ رشک تھیں۔ اس کے چلنے کا انداز صاف بتلا رہا تھا کہ نہ اسے گھر پہنچنے کی جلدی ہے اور نہ تاریکی چھا جانے کا خوف۔ ہاں مویشیوں کی تیز رفتاری ان بچوں کی کشش کی شاہد تھی جنھیں وہ پیچھے چھوڑ آئی تھیں۔

پگڈنڈی تو مجھ سے ذرا فاصلے سے گذرتی تھی لیکن گوالا راستہ چھوڑ کر میری

طرف آیا۔ کتنا تنومند جوان تھا۔ چوڑا چکلا سینہ۔ کھلی کھلی پیشانی۔ کندھے پر لٹھ۔ تندرستی اور جوانی کی تصویر۔ لیکن میرے پاس پہنچتے ہی اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ ذرا اکڑ کر بولا۔

"کیوں جناب! یہ آپ ہماری ہی چھاتی پر مونگ دلنے لگے"

میں نے ذرا دلچسپی کے انداز سے اس گنوار کی طرف دیکھا اس کے اس گنوارپن پر مجھے بیساختہ ہنسی آگئی

"یہ لٹھ دیکھتے ہو نا؟" اس نے لٹھ کو پتھریلی زمین پر ٹھکراتے ہوئے کہا "اور میرا نام بھی شاید آپ کو معلوم ہوگا"

"نہیں!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے تو معلوم نہیں"

"میرا نام شیر علی ہے" اس نے ذرا قہر آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا "سن لیا؟"

"ہاں!" میں نے ہنسکر کہا "سن لیا میاں شیرو.....!"

لیکن وہ بات کاٹ کر بولا

"شیرو نہیں شیر علی۔ یہ بینی آپ کو مہنگی پڑے گی"

اتنا کہہ کر وہ اپنے ریوڑ کی طرف تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔ اور میں حیران کہ اس کمبخت کا میں نے بگاڑا کیا۔ ریوڑ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا لیکن بھیڑوں کی بھائیں بھائیں ابھی تک سنائی دے رہی تھی اور کہیں کہیں سے کبک کی مست آواز نیل سر کے منظر میں رومانیت پیدا کر رہی تھی۔ اور کہسار کسی بے راہ رو کی طرح

اپنے دامن میں حسرت اور ارمان لئے کھڑا نظر آرہا تھا۔ کائنات کی خاموشی سے معلوم ہوتا تھا گویا کسی فکر میں ہے۔ آسمان پر ہلکی ہلکی سیاہی پھیل رہی تھی۔ نیل سر کا پانی جو ابھی ابھی سنہری جھلک دکھلا رہا تھا نیلگوں ہو چلا تھا اور ہوا اپنے نظر سے اوجھل رہنے والے پاؤں سے اس کے سینے پر رقص کر رہی تھی۔ ایک لنڈ منڈ درخت کی سوکھی شاخ پر شاہین خاموش بیٹھا قدرت کے اس عجیب تغیر پر فلسفیانہ انداز سے غور کر رہا تھا اور خرگوش کا ایک جوڑا شاہین کے خوف سے جھاڑیوں میں سہما سہما سا بیٹھا تھا۔ یہ خاموشی۔ یہ سکوت اور اُس پر شام کا سہانا وقت۔ اور گرد و پیش کے دلکش مناظر طبیعت میں ایک چٹکی سی لے رہے تھے۔ لیکن اس کمبخت شیرو کی باتوں نے کچھ بدمزا سا کر رکھا تھا۔ بھلا میں اُس کے سینے پر کیوں مونگ دلنے لگا۔ اس کی ڈگر الگ میری راہ الگ۔ نہ مجھے اس کے مشاغل سے سروکار نہ کسی کو میری بے راہ روی سے واسطہ۔ ہاں صفیہ! لیکن مجھے تو آج تک اُس سے بات کرنے کا بھی موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ لیکن شیرو کو صفیہ سے کیا واسطہ! مان لیا کہ دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے اور شاید ایک ہی فضا میں پلکر جوان بھی ہوئے ہوں۔ لیکن شیرو تو گوالا تھا اس کا باپ بھی گوالا اور خاندان بھی گوالوں کا۔ لیکن صفیہ! زمیندار کی چھوکری۔ گھرانا بھی اچھا اور گاؤں میں عزت اور توقیر بھی۔ اور شاید شیرو ہی کے کنبے کا کوئی گوالا اس کے باپ کے ٹکڑوں پر پیٹ بھی پالتا ہو۔ جوش رقابت! لیکن مجھے اپنے اس خیال پر ہنسی آگئی اور وہ بدمزہ کرنے والے احساسات سب کافور ہو گئے۔ بدن میں زندگی کی نمو محسوس

ہونے لگی۔ بجھی ہوئی طبیعت میں جولانی کی جھلک نظر آنے لگی۔ اور شام کی ہلکی ہلکی تاریکیوں میں رومانیت مستور معلوم ہونے لگی۔ شاہین نے بیٹھے بیٹھے دو ایک بار کرخت سی آواز نکالی اور کہسار کی طرف پرواز کر گیا اور خرگوش خطرہ دور ہو جانے کے بعد جھاڑیوں میں اِدھر اُدھر اُچھلنے کودنے لگے۔ یہ چھوٹے چھوٹے چوپائے کیف حیات سے اسوقت سرشار معلوم ہوتے تھے لیکن افسوس ؎

کوئی نہیں غمگسار انساں!
کیا تلخ ہے روزگارِ انساں!

عام طور پر تو میں سرِ شام ہی گھر لوٹ آیا کرتا تھا لیکن آج کسی تھکے ماندے مسافر کی طرح اسی پتھر پر لیٹ رہا۔ رات کی سیاہ چادر ہر چیز پر پھیلی ہوئی تھی۔ سازِ قدرت خاموش ہو چکا تھا۔ ہوا اتنی سرد تھی کہ وہ پتھر جس پر میں لیٹا ہوا تھا اُس کی ٹھنڈک میرے بدن کو بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ آخر ماہ منیر قلّۂ کوہ پر جلوہ نما ہونے لگا۔ اور وہ خوبصورت مناظر جو تاریکیوں میں روپوش ہو چکے تھے اُن کے اوپر سے اس طرح سیاہی اُٹھنے لگی جیسے کوئی حسینہ چہرے سے آہستہ آہستہ نقاب اُلٹ رہی ہو۔ میرے دیکھتے دیکھتے کہسار کی وہ چوٹی جسے قدرت نے برف کی دستار بندھا کر دوسروں سے سرفراز بنا رکھا تھا کسی سیمیں تن کی طرح چمکنے لگی پھر تھوڑی ہی دیر میں کائنات کا ذرہ ذرہ چاندی کی طرح چمک اُٹھا درختوں کے ہلنے سے شاخوں کے اندر سے چاند کی روپہلی کرنیں اس طرح جلوہ ریز ہوئیں

جیسے آسمان کے رہنے والے نور کی پچکاریاں ایک دوسرے پر چھوڑ رہے ہوں اور شعاع مہتابی نیل سر کے پانی سے بوس وکنار کرتی نظر آنے لگی۔ اُس وقت عقب میں سے اچانک صفیہ کی دلکش آواز ع

سجنوا تم بن چاندنی راتیں

سُنائی دی۔ وہ اِدھر ہی کو گاتی چلی آرہی تھی ؎

رات موہنی نہیں چین ہی من کو برہا آگ لگی ہے من کو!
اور اِک ٹھیس لگی ہے لگن کو ساون کی ہیں راتیں
سجنوا تم بن چاندنی راتیں
بالے جوبنوا کو ترسائیں

یہ پیاری آواز کان پڑتے ہی میں چونک سا پڑا۔ لیکن اس ویرانے میں صفیہ کی آواز کہاں؟ اس سے تو مجھے انکار نہیں کہ اسوقت میں تصوّر جانا ہی کئے بیٹھا تھا لیکن آواز کا تصوّر؟ کچھ کہہ نہیں سکتا ممکن ہے کہ میرے کانوں نے مجھے دھوکا دیا ہو۔ لیکن نہیں۔ یہ صفیہ ہی تو تھی جو رات کی خاموشیوں کو اپنے لحن داؤدی سے برہم کر رہی تھی۔ صفیہ! چاندنی سے زیادہ خوبصورت اور برگ گل سے نازک تر! کسی شاخ نہال کی طرح لچکتی کبک کی طرح جھومتی وارفتگی کے عالم میں گاتی چلی آرہی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں اور میں اُن ہی جھاڑیوں میں سے قدرت کے خاموش مناظر

بھول کر قدرت کی اس جیتی جاگتی اور خوبصورت تصویر کو جھانک رہا تھا جب صفیہ جھاڑیوں سے نکلی تو اُس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ اور ٹھٹک کر جہاں تھی وہیں کی وہیں رہ گئی۔

"صفیہ!" بے اختیار میرے مُنہ سے نکلا اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ڈر گئیں کیا؟"

"نہیں! نہیں!" اُس نے ہنسکر کہا۔ "میں آپ سے کیوں ڈرنے لگی؟"

ہم دونوں ایک ہی پتھر پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ آج پہلی مرتبہ مجھے اسکا قُرب حاصل ہُوا تھا۔ وہ نیچی نظریں کئے بیٹھی تھی اور میری نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ ایک چاند تو آسمان پر چمک رہا تھا اور دوسرا میرے سامنے بیٹھا جگمگا رہا تھا۔ آسمان کے چاند سے تو کائنات چمک رہی تھی اور زمین کے چاند نے میرے نہاں خانۂ دل کو منور کر رکھا تھا۔

"صفیہ!"

"چُپ کیوں ہو؟"

"آپ چُپ کیوں ہیں؟"

"میں تو بول رہا ہوں۔"

"میں بھی بول رہی ہوں۔"

"آج گھر سے کیسے نکل آئیں؟" میں نے پُوچھا

"معلوم نہیں!"

میں تعجب سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ہنسکر بولی۔

"آپ میری طرف کیوں دیکھا کرتے ہیں؟"

"کب؟"

"جب میں ندی پر آتی ہوں۔"

"تم پانی بھرنے آتی ہو یا جھولا جھولنے؟" میں نے پوچھا۔

"میں؟" اُس نے مُسکرا کر کہا

"ہاں!" میں نے کہا

"ہاں!" اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں کیا؟" میں نے اُسکا خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔" صفیہ نے ہنسکر پوچھا

"نہیں! میں نے کہا۔ "صرف تمہیں دیکھنے کا!"

"لیکن آپ تو ہر وقت کتاب ہاتھ میں لئے ہوتے ہیں۔" اُسنے کہا۔

"کتاب ہاتھ میں ہونے سے کیا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پھر؟" اُس نے پوچھا

"پھر کیا؟" میں نے پوچھا

وہ گلِ نو بہار کی طرح ہنسنے لگی۔

"صفیہ!"

"گاؤں والے تو مجھے صافی کہتے ہیں" اس نے کہا۔

"میں گنوار تو نہیں" میں نے کہا۔

"میں تو ہوں" صفیہ نے ہنسکر کہا۔

"میں تو نہیں سمجھتا" میں نے جواب دیا۔

"آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں" صفیہ نے پوچھا

"خوبصورت!"

"یہاں آج کیوں بیٹھے ہے" اُس نے پوچھا۔

"پہلے تم میری بات کا جواب دو" میں نے کہا۔

"کیا؟"

"تم ندی پر پانی بھرنے آئی ہو یا جھولا جھولنے!" میں نے پھر وہی سوال کیا۔

"بتلاؤں!" اُس نے شرارت آمیز آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "سچ کہدوں!"

"تو کیا جھوٹ کہو گی؟" میں نے کہا

"آپ کو دیکھنے!" یہ کہتے ہی اُس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور میں نے جانا شاید چاند ہالے میں آگیا۔

"صفیہ!" میں نے چہرے سے اُس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

تمہیں مجھ سے محبت ہے۔"

"کیا؟" اُس نے ذرا تعجب سے پوچھا

"تمہیں مجھ سے محبت ہے صفیہ!" میں نے پھر پوچھا۔

"وہ کیا ہوتی ہے؟" اس نے شرارت آمیز تبسم سے پوچھا۔

"بتلاؤں!" میں نے کہا

"دیکھیے!" وہ بولی "کتنی پیاری چاندنی ہے"

"لیکن تم تو چاند سے بھی زیادہ پیاری ہو" میں نے اُس کی ٹھوڑی ہلا کر کہا۔

"اسی لیے آپ مجھے دیکھا کرتے ہیں" اُس نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے کہا۔ "ان آنکھوں سے بھی اور دل کی آنکھوں سے بھی"

"دل کی آنکھوں سے کیسے؟" اُس نے پوچھا

"تم اپنے دل سے پوچھو" میں نے جواب دیا۔

"نہیں!" وہ مسکرا کر بولی۔ "آپ ہی بتلا دیجئے"

"بتلا دوں!" میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

"ہاں بتلا دیجئے" صفیہ بولی۔ "ابھی بتلا دیجئے نا۔ بتلائیے بھی!"

میں نے ایک ہاتھ اس کی پتلی سی کمر میں ڈال کر اُسے اپنی طرف کھینچا ہی تھا کہ عقب سے کسی نے گرج کر کہا۔

"بدمعاش چھوڑ دو سے!"

میں نے صفیہ کی کمر سے ہاتھ ہٹائے بغیر پلٹ کر دیکھا تو شیر علی کندھے پر لٹھ رکھے کھڑا تھا غصے سے اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ جست بھر کر آگے آیا اور صفیہ کا ہاتھ پکڑ کر بولا

"اب لگیں تم بھی پر پرزے جھاڑنے۔ اُٹھ گھر چل۔"

"تم ہو کون؟" صفیہ اسکا ہاتھ جھٹک کر بولی۔"دور ہو یہاں سے۔"

"مجھے نہیں جانتی!" شیرو دانت پیس کر بولا

"جانے میری بیزار!" صفیہ نے غصے سے کہا

"راتوں کو چھپ چھپ کر عشقبازیاں ہوتی ہیں" شیرو بولا "کیوں کیسے پکڑا"

بدمعاش کا لفظ سنکر مجھے غصہ تو آیا تھا لیکن اُن دونوں کی نوک جھونک کچھ ایسی پُرلطف تھی کہ میں چُپکا بیٹھا رہا۔

"دُور دفعان نہیں ہوتے" صفیہ نے پھر کہا۔

"میں دُور دفعان ہو جاؤں" شیرو بولا۔ "اور تم عاشق سے گلچھرے اُڑاؤ۔"

"بکواس بند نہیں کرو گے۔" کہتے ہوئے صفیہ نے اُسکے مُنہ پر ایک تھپڑ دے مارا۔

"حرّافہ!" شیرو غضبناک ہو کر بولا۔ "تیری قضا آئی جو ....

لیکن پیشتر اس کے کہ وہ فقرہ پورا کرے اُس نے اچانک ایک خوفناک

چیخ ماری اور "شاہسوار شاہسوار" کہتا ہوا گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔

صفیہ بھی یہ نام سُنکر گھبرا سی گئی اور خوفزدہ نگاہوں سے جھیل کی طرف دیکھنے لگی۔ میں بھی اسی جانب دیکھ رہا تھا جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک سیاہ پوش نوجوان ایک شکیں رنگ کے گھوڑے پر سوار کھڑا تھا اُس کے ہاتھ میں نیزہ تھا گھوڑا بار بار سُم مار رہا تھا پتھریلی زمین پر سُم جب پڑتا تو چنگاریاں نکلتیں۔ اُسے دیکھتے ہی صفیہ نے خوفزدہ ہو کر ایک چیخ ماری۔ اور بیہوش ہو کر گری لیکن میں نے لپک کر اُسے تھام لیا اور اپنی آغوش میں لے لیا لیکن جب میں نے جھیل کی طرف دیکھا تو وہاں چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ خوبصورت صفیہ میری گود میں بیہوش پڑی تھی اور کہیں دُور فاصلے پر سے شاہیں کی کرخت آواز سنائی دے رہی تھی۔

اس واقعے کے بعد صفیہ دو روز تک کہیں نظر نہ آئی میں نے دو تین بار گاؤں کا چکر بھی لگایا۔ پوچھتا تو کس سے پوچھتا۔ کیا پوچھتا؟ صفیہ کہاں ہے؟ مجھ سے اس سے کیا مطلب! ہاں شیرو اریوڑ لیکر آتے جاتے صبح و شام نظر آتا لیکن اب وہ نیلی سر کی جانب نہیں جاتا تھا شاہسوار سے ڈر گیا ہوگا شاید لیکن یہ شاہسوار کون تھا؟ کوئی ڈاکو وا کو ہوگا۔ یا ممکن ہے میرا وہم ہی ہو لیکن وہم کیسے ہو سکتا ہے میں نے تو اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھا تھا۔ بہرکیف ڈاکو ہو یا بھوت شیرو کا ڈر کر بھاگ جانا اور خوبصورت صفیہ کا دیکھتے ہی بیہوش ہو جانا تعجب سے خالی نہ تھا۔ دل میں آیا کہ کسی طرح یہ راز معلوم کرنا چاہیئے لیکن وہ تو چوہدری کی

چاندنی رات تھی۔ اور اب رات اندھیری۔ لیکن شوق بُری بلا ہے جب دوسرا روز بھی ختم ہوا اور صفیہ! محبوب صفیہ کہیں نظر نہ آئی۔ تو میں شام ہوتے ہی نیل سر کی راہ پر ہولیا۔ وہی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگھڈنڈی، اور پگھڈنڈی کے دونوں جانب جنگل، اور جنگل کے عقب میں پہاڑ، اور پہاڑوں پر تفکّر کا عالم۔ نہ کوئی آواز نہ کہیں کوئی کھٹکا۔ بس ایک جھینگر تھا جس کی آواز اِدھر اُدھر سے سُنائی دے رہی تھی۔ مجھے نہ جلدی تھی، نہ خوف۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے چلا جا رہا تھا پگھڈنڈی ختم ہوئی تو سامنے برف پوش چوٹی نظر آنے لگی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور یہ برف پوش دخترِ کہسار نیلم پری کی طرح نیلے لباس میں ملبوس نظر آتی تھی۔ کچھ اور آگے جا کر آج بھی اسی لنڈ منڈ درخت پر شاہین خاموش بیٹھا نظر آیا۔ اُس روز بھی اکیلا تھا۔ اور آج بھی اکیلا۔ شاید میری طرح یہ بھی دنیا میں اکیلا ہی ہو۔ میں نیل سر کے کنارے اُسی پتھر پر جہاں میں ہمیشہ بیٹھا کرتا تھا جا بیٹھا۔ نیل سر پر بھی نیلگوں رنگ چھایا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی۔ زہرہ نیلے نیلے آسمان پر اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ ایک جگنو جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک جھاڑی میں اس طرح چمک رہا تھا جیسے کسی حسینہ کے ماتھے پر بندیا۔

میرے بیٹھے بیٹھے آسمان تاروں سے جگمگانے لگا۔ ہوا کی سرسراہٹ بھی معلوم ہونے لگی لیکن جس چیز کی جستجو میں میں بیٹھا تھا وہ کہیں نظر نہ آئی کب تک بیٹھا۔ کب تک انتظار کرتا کچھ یقین ہو چلا تھا کہ اس روز جو کچھ دیکھا تھا محض وہم تھا۔ آخر واپس لوٹا۔ اگر راستے سے واقف نہ ہوتا تو شاید اندھیرے میں

چلنا دشوار ہوتا۔ پکھڈنڈی پر پہنچا ہی تھا کہ اچانک گھوڑے کے سموں کی آواز سنائی دی۔ پہلے دُور سے پھر ایسا معلوم ہوا کہ کوئی کہیں قریب ہی سے گھوڑا دوڑتا گذر گیا ہے۔

ہنسئے گا نہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ بن دیکھے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اندھیرے میں تیزی سے قدم اُٹھنے لگا۔ دل کی دھڑکن بھی کچھ تیز تھی۔ کیوں؟ دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ بہرکیف جب گاؤں کے قریب پہنچا تو اطمینان سا ہُوا۔ ابھی مکان سے کچھ فاصلہ پر ہی تھا کہ کتے بھونکنے لگے۔ کتا بھی کتنا وفادار حیوان ہے۔ روٹی کا ایک ٹکڑا ڈالدیجئے اور شبانہ روز خدمت لے لیجئے۔ کوئی آٹھ بجے ہوں گے لیکن گاؤں ابھی سے سنسان سا نظر آرہا تھا۔ گاؤں والوں کی بھی کیا قابل رشک زندگی ہے۔ دن بھر کام کاج سے فارغ ہو کر کیا مزے سے پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں۔ مکان سے ابھی کچھ فاصلہ ہی پر تھا کہ درختوں کے جھنڈ کے نیچے کسی کا سایہ نظر آیا۔ استغفر اللہ! جانے آج مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایسے ہی دل دھڑکنے لگا پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ میں نے آج تک خطرہ کو خطرہ نہ جانا تھا۔ خیر! یہ سایہ جلدی سے میری طرف آیا۔ اوہو! یہ تو صفیہ تھی۔

"آپ کہاں سے آرہے ہیں اسوقت" اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

"گھوم گھام کر" میں نے جواب دیا۔

"نیل سر کی جانب گئے تھے آپ؟" صفیہ نے پوچھا۔ "اندھیرے میں کیوں چلے گئے آپ؟"

"کچھ ہرج ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"مت جایا کیجیے۔" صفیہ ذرا میرا ہاتھ دبا کر بولی۔

"تم یہاں کیا کر رہی تھیں۔" میں نے پوچھا۔

"میں!"

"ہاں تم!"

"شیرو سے ملنے آئی ہوگی۔"

"میں؟"

"اور کون؟"

"جہنم میں جائے مُوا۔" صفیہ میرا ہاتھ جھٹک کر بولی۔ میرے ہاتھ کا یوں جھٹک دینا اُس کے دلی خیالات کا ترجمان تھا۔

"مجھے اِس سے کیا غرض؟"

"اُسے تو ہے!" میں نے جواب دیا۔

"مجھ سے!" صفیہ نے پوچھا

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"کیا؟"

"یہ تم جانو۔" میں نے جواب دیا۔ "میں پردیسی کیا جانوں؟"

یہ سُنکر صفیہ اندھیرے میں میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں کی دلآویز چمک اندھیرے میں بھی اپنی دلکشی دکھا رہی تھی۔ اُس نے ایک لانبا

سانس لیا اور بولی۔

"وہی دن کچھ اچھے تھے جب میری آپ سے بول چال نہ تھی۔"

"صفیہ!" میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ "ناراض ہوگئیں کیا۔"

"چھوڑ دیجئے میرا ہاتھ!" وہ ہاتھ چھڑانے کی کچھ ایسے ہی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

ساتھ ہی درختوں کی جانب سے کسی نے کہا۔

"کیونکہ تم بدمعاش ہو۔"

یہ میاں شیر علی کی آواز تھی۔ یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ جھپٹ کر درختوں کے سامنے سے نکلا اور میرے پاس آکر گھونسہ تان کر بولا۔

"میں تو تمہیں بہت شریف آدمی سمجھتا تھا لیکن"

"لیکن!" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "اُس روز میں نے تمہیں معاف کر دیا تھا۔"

"اور آج بھی۔" صفیہ بیچ میں آکر اور میری بات کاٹ کر بولی "میری خاطر سے جانے دیجئے!"

لیکن شیرو نے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور لٹھ غصّے سے زمین پہ مار کر بولا۔

"ہٹ جا تو صافی! آج نپٹ لوں گا میں اس سے۔"

لیکن صفیہ نے آگے بڑھ کر اُس کی لٹھ پر ہاتھ ڈال کر کہا۔
"ہوش کی دوا کرو۔"
"میں یا تم؟" شیرو بولا۔ "میں بہت دنوں سے تمہارے تیور دیکھ رہا ہوں۔ لیکن اب تم بہت بڑھ چلیں۔"
"کیا کیا میں نے؟" صفیہ نے پوچھا۔
"تم اس سے کیوں ملتی ہو۔" شیرو نے پاگل گنواروں کی طرح پوچھا۔
"کیا لگتا ہے یہ تمہارا۔"
"تمہیں کیا؟" صفیہ نے پوچھا۔
"تمہیں معلوم نہیں۔" شیرو نے جواب دیا۔
"نہیں!" صفیہ نے جواب دیا۔
"صافی!" شیرو بولا۔ "اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔"
"کس کا؟" صفیہ نے پوچھا۔
"ان گھاتوں اور باتوں کا۔" شیرو نے جواب دیا۔
میں پاس کھڑا دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ شیرو مجھ سے بولا۔
"چلے جاؤ یہاں سے! تم کیوں کھڑے ہو یہاں؟"
"تمہیں ان سے کیا غرض!" صفیہ نے کہا۔ "تم مجھ سے بات کرو۔"
"لیکن یہ یہاں کھڑا کیوں ہے؟" شیرو نے غصے سے کہا۔
"ان کی مرضی!" صفیہ نے جواب دیا۔

"چلو میرے ساتھ" شیرو نے صفیہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"کہاں؟" صفیہ نے پوچھا

"گھر!" شیرو نے جواب دیا۔

"تم جاؤ!" صفیہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "میری جب مرضی ہوگی آؤں گی"

"تمہاری مرضی کی ایسی تیسی" شیرو نے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

"چلتی ہو یا میں کوئی اور تدبیر کروں"

اب مجھ سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا

"شیرو!" میں نے کہا "ہاتھ چھوڑ دو"

"تم کون بیچ میں بولنے والے" شیرو نے غضبناک ہو کر پوچھا

"نہیں چھوڑو گے" میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر پوچھا۔

"نہیں!" شیرو نے اکڑ کر جواب دیا۔

یہ سنتے ہی میں نے اس زور سے ایک گھونسہ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔

"جانے دیجئے!" صفیہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی "بیوقوف ہے یہ تو"

لیکن شیرو گرتے ہی اُٹھا اور لٹھ سنبھال کر مجھ پر وار کیا ہی چاہتا تھا کہ اچانک کہیں پاس ہی سے ایک گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ میں اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لیکن کہیں کوئی گھوڑا یا گھوڑے کا

سایہ نظر نہ آیا۔ صفیہ خوف سے مجھ سے چمٹی ہوئی کانپ رہی تھی۔ اور میاں شیر علی کہیں رفوچکر ہو چکے تھے۔

میں سہارا دیتا ہوا صفیہ کو درختوں کے جھنڈ کے نیچے لے آیا۔ وہ میرے زانو پر سر رکھ کر نرم نرم گھاس پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ تنفس کچھ اس طرح کا تھا جیسے کوئی بہت تھکا ماندہ ہو۔

"صفیہ!" میں نے اُس کی پیشانی پر سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ذرا آنکھیں تو کھولو۔"

"چلا گیا وہ؟" صفیہ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

"کون شیرو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں!" صفیہ بولی۔ "شاہسوار!"

"کون شاہسوار؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو ہمارے پاس سے گھوڑے پر گذرا تھا۔" صفیہ نے جواب دیا۔

"میں نے تو کسی کو دیکھا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں نے دیکھا تھا۔" صفیہ بولی۔ "آپ نے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز تو سنی تھی۔"

"ہاں سنی تھی۔" میں نے کہا۔ "کوئی آدمی گاؤں کو جاتا ہوگا۔"

"صفیہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے خوبصورت ہاتھ سے چاند سے چہرے

پر سے بال ہٹا کر بولی۔

"اُس روز جھیل پر آپ نے کسی کو دیکھا تھا؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "کوئی راہگذر ہوگا۔"

"راہگذر نہیں!" صفیہ بولی۔ "وہ ہی تو شاہسوار تھا۔"

"یہ شاہسوار ہے کون؟" میں نے پوچھا۔ "کوئی ڈاکو ہے کیا؟"

"توبہ! توبہ!" صفیہ بولی۔ "ایسا مت کہئے!"

"کون ہے آخر!" میں نے پھر پوچھا۔

"شاہسوار" صفیہ نے جواب دیا۔

"لیکن یہ شاہسوار ہے کون بلا" میں نے پوچھا۔

"یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں" صفیہ نے اپنا خوبصورت سر میرے شانے کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"تم اُس سے ڈرتی کیوں ہو؟" میں نے اسکی کمر میں ہاتھ ڈال کر پوچھا۔

"ایک دنیا ڈرتی ہے" صفیہ بولی "میں ہی تو نہیں ڈرتی۔"

"لیکن کچھ وجہ بھی!"

"آپ نے آنکھوں سے سب کچھ دیکھ بھی لیا" صفیہ بولی۔ "اور پھر بھی مجھ سے پوچھتے ہیں۔"

"میں نے تو کچھ دیکھا نہیں" میں نے کہا

"ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے" صفیہ نے کہا۔ کہ جھیل پر آپ نے بھی دیکھا تھا۔"

"ہاں! ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "کوئی مسافر ہی تو تھا۔"

"خیر!" صفیہ اپنا نرم نرم رخسار میرے شانے پر ملتے ہوئے بولی۔
"چھوڑیئے اس ذکر کو اس وقت۔ کوئی اور بات کیجئے۔"
"تمہیں مجھ سے محبت ہے صفیہ؟" میں نے پوچھا۔
"کوئی اور بات کیجئے" صفیہ نے ہنسکر کہا۔
"مجھے تم سے محبت ہے صفیہ!" میں نے اپنا سر اس کے خوبصورت سر کے ساتھ ملا کر کہا۔
"کوئی اور بات کیجئے!" صفیہ نے پھر ہنسکر کہا۔
"صفیہ! تم بہت حسین ہو" میں نے کہا۔
"بس!" صفیہ نے ہنسکر کہا۔ "اس کے علاوہ اور کوئی بات تو آپ کو آتی ہی نہیں۔"
"صفیہ!" میں نے کہا "تم میری ہو جاؤ تو میری دنیا بھی تمہاری طرح خوبصورت بن جائے۔"
"پھر کیا ہو؟" صفیہ نے پوچھا۔
"تو زندگی کے یہ چار دن مزے سے کٹ جائیں" میں نے جواب دیا۔
"زندگی کا کیا بھروسہ!" صفیہ نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "دم کا کھیل ہے اور بس!"
"ٹھیک!" میں نے کہا۔ "لیکن جو دم مزے سے گذرے وہی غنیمت ہے۔"

"مزے سے گذرے کیسے؟" صفیہ بولی۔ "اپنے بس کی تھوڑی ہی بات ہے"

"صفیہ! میں نے ہنسکر کہا۔ ع

"تم جو چاہو تو میرے درد کا درماں ہوجائے"

"میں کوئی حکیم تو نہیں" صفیہ نے ہنسکر کہا۔

"تم حکیم نہیں! میں نے کہا۔ "لیکن تم مسیحا تو ہو"

"مجھ سے سیدھی سیدھی باتیں کیجئے!" صفیہ بولی۔ "میں کیا جانوں مسیحا کیا ہوتا ہے میں آپ کی طرح پڑھی لکھی تو نہیں"

"میرے لئے تم ہی مسیحا ہو صفیہ!" میں نے کہا۔ "تم میرے پاس ہوتی ہو تو میری دُنیا بدل جاتی ہے"

"اور جب میں پاس نہ ہوں تو؟" صفیہ نے شرارت آمیز تبسم سے پوچھا۔

"پھر ہجوم غم!" میں نے کہا

"آپ بھولے ہوئے ہیں" صفیہ بولی۔

"تم مجھے راہ پر ڈال دو صفیہ!" میں نے کہا۔

"جسے خود اپنی ہی راہ معلوم نہ ہو" صفیہ نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "وہ دوسرے کو کیا راہ پر ڈالے گا۔ آپ مجھے بھول جانے کی کوشش کیجئے!"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مت پوچھئے!" صفیہ نے جواب دیا۔

"سمجھ گیا" میں نے کہا۔ "میاں شیر علی ....."

"دیکھئے!" صفیہ بات کاٹ کر بولی۔ "جس بات سے مجھے چڑ ہو وہ نہ کہئے!"

"پھر بھول کیوں جاؤں؟" میں نے کہا۔ "کچھ وجہ بھی تو بتلاؤ آخر!"

"وجہ تو میں بتلا دوں" صفیہ بولی۔ "لیکن شاید آپ کو یقین نہ آئے۔"

"اچھا صفیہ!" میں نے اُس کی کمر سے ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔ "مت بتلاؤ۔"

"بس ناراض ہو گئے آپ؟" یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا خوبصورت سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ اور اپنی مرمریں باہیں میری گردن میں ڈال کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اور آنکھوں آنکھوں میں وہ جو کچھ مجھ سے کہنا چاہتی تھی اُس نے کہہ دیا۔ اُس نے میری گردن کو ذرا اپنی طرف کھینچا۔ میرا سر بھی جھکنے لگا۔ پہلے سر سے سر ملا۔ پھر ہونٹ سے ہونٹ۔ یہ کیفیت کب تک رہی معلوم نہیں۔

"بس!" آخر صفیہ نے میری آغوش سے علیحدہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہو گئی نا وجہ آپ کو معلوم!"

"تو پھر بھول کیوں جاؤں۔" میں نے پوچھا۔

"چپ رہئے!" صفیہ نے میرے زانو پر سر رکھ کر اور لیٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے بس اب سونے دیجئے!"

لیکن اسوقت مرغ سحر سونے والوں کو پیغام بیداری دینے لگا۔ اور درختوں میں پرندوں کے آہستہ آہستہ بولنے کی آواز سنائی دینے لگی۔

صفیہ جو آنکھیں بند کئے لیٹی تھی، اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور جمائی لیکر بولی۔
"میری قسمت میں آرام کہاں؟ اُٹھئے آپ بھی!"
"گھر چلو گی"۔ میں نے پوچھا۔
"میرے لئے گھر اور باہر سب یکساں ہے"۔ اُس نے ایک آہ بھر کر کہا
جب ہم ندی پر پہنچے تو صفیہ نے ہاتھ مُنہ دھویا۔ پھر دوپٹے کے پلّو سے پانی خشک کرتے ہوئے بولی۔
"میں نے آپ کی نیند بھی خراب کی۔ معاف کر دیجئے!"
"خدا کرے!" میں نے کہا۔ "اس طرح روز روز میری نیند خراب ہوا کرے"
"بھول جائیے یہ باتیں! بھول جائیے"۔ یہ کہتی ہوئی صفیہ گھر کیطرف چل دی۔

صفیہ کی ہر ادا اس کی شاہد تھی کہ اُسے مجھ سے محبت ہے۔ میں جانتا تھا کہ اُسے میرے پاس بیٹھنا بہت پسند ہے۔ وہ میری باتوں کو دلچسپی سے سُنتی۔ لیکن جب تان ٹوٹتی تو اس "بھول جائیے" پر۔ یہ "بھول جائیے" میرے لئے ایک معمّہ تھا۔ شیرو کے نام سے اُسے چڑ تھی۔ اور شاہسوار کے متعلق کچھ کہنا سننا اُسے پسند نہ تھا۔ اِدھر مجھے یہ کُرید لگی تھی کہ یہ شاہسوار ہے کون۔ شیرو بظاہر خاموش تھا۔ لیکن چُپکے چُپکے لوگوں میں میری اور صفیہ کی ملاقاتوں کا چرچا کرتا رہتا صفیہ کو اُس کی کمینگی کا علم تھا۔ مگر چنداں پرواہ نہ تھی مجھے شیرو سے تو کچھ واسطہ نہ

تھا لیکن شاہسوار کے خیال سے طبیعت میں کچھ اُلجھن سی پیدا ہو جاتی میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اس عقدہ کو حل کروں۔ نیل سر پر میں نے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اُس رات کو جنگل کے پاس بھی ایک گھوڑے کے سموں کی آواز میں نے اپنے کانوں سے سُنی تھی۔ اور اُس روز جب میں نے شیرو کے ایک گھونسہ مارا تھا۔ ایک گھوڑا کہیں ہمارے پاس ہی ہنہنایا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ اسے اپنے وہم کی تخلیق کہوں لیکن واقعات کو کیسے جھٹلاتا۔ جسے آنکھوں سے دیکھا ہو کس طرح کہتا کہ نہیں دیکھا۔ آخر ایک روز میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ صفیہ سے ضرور پوچھ کر چھوڑوں گا۔ میرا خیال تھا کہ صفیہ کو بتلانے میں عُذر ہو گا۔ لیکن یہ خیال تو بالکل غلط نکلا۔ اور اسکا مجھے تعجب بھی تھا۔

ایک روز ہم دونوں گاؤں سے بہت دُور دھان کے کھیتوں کے کنارے بیٹھے تھے۔ کھیت لہلہا رہے تھے۔ اور کھیتوں میں پانی چمک رہا تھا۔ فصل پکنے کو تھی اور دھانوں کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ کھیتوں میں کام کرنے والے دن بھر کا کام کاج ختم کر کے گاؤں کو جا چکے تھے۔ یہ مشرقی ممالک کے تیز اعظم کی رخصت کا وقت تھا۔ آسمان پر سفر کے سامان ابھی سے ہو رہے تھے ہم دونوں پتھروں پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ ایک ننھی سی ندی ہمارے پاؤں چھوتی لہراتی اور بل کھاتی کھیتوں کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی ہم دونوں میں نباہ کے وعدے ہو چکے تھے۔ اب کچھ اطمینان کی باتیں ہو رہی تھیں۔ شیرو نے گاؤں

میں ہم دونوں کو خوب بدنام کر دیا تھا۔ اور اب صلاح یہ تھی کہ جتنی جلد ہو اس گاؤں کو چھوڑ دیا جائے۔ مجھے جلدی پر اصرار تھا لیکن صفیہ اس پر آمادہ نہیں ہوتی تھی مجھے معلوم تھا کہ صفیہ کی ماں مر چکی ہے۔ اور اُس کے باپ نے دوسری شادی کر رکھی ہے۔ اور اس دوسری شادی سے بھی اُس کے دو بچے ہو چکے ہیں۔ دوسری بیوی کی ریشہ دوانیوں کے باعث نامہربان باپ بھی اب دل سے یہ چاہتا ہے کہ اُسے صفیہ سے جلدی چھٹکارا ہو جائے۔ اور غالباً اسی وجہ سے اُس نے صفیہ سے آج تک میرے متعلق کچھ کہا سُنا بھی نہ تھا اور یہ تو خود صفیہ مجھ سے کئی بار کہہ چکی تھی۔ کہ گھر اس کے لئے جہنم ہے۔ اور سوتیلی ماں کو اس سے بات تک کرنا گوارا نہیں۔ یہ سب باتیں صفیہ ہی نے مجھے بتلائی تھیں لیکن جب میں گاؤں جلدی چھوڑنے کا ذکر کرتا تو وہ کچھ کشمکش و پیچ میں پڑ جاتی۔

"صفیہ!" میں نے کہا۔ "اگر تم ناراض نہ ہو تو ایک بات کہوں"

"کیا؟"

میں نے کہا۔

"یا تو تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں، یا تمہیں گاؤں چھوڑنا پسند نہیں"

صفیہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"مجھے آپ پر اعتبار بھی ہے اور گاؤں چھوڑنا بھی ناپسند نہیں۔ لیکن....."

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کیا کروں میں؟" وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ "اس زندگی سے

تو موت بہتر ہے

"صفیہ! میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا" یہ کیسا کہہ رہی ہو"

"میں جو کچھ کہہ رہی ہوں" وہ بولی" اُس کا مطلب میں ہی سمجھتی ہوں"

"مجھے نہ بتلاؤ گی" میں نے پوچھا

اُس نے دو ایک بار سر ہلایا۔ اُس وقت وہ یاس کی تصویر بنی بیٹھی تھی اور کچھ اس انداز سے سامنے کی جانب دیکھ رہی تھی جیسے کوئی مسافر منزل سے دور بیٹھا منزل کی سمت دیکھ رہا ہو۔ پھر خود بخود بولی۔

"کیا اچھا ہوتا کہ آپ اِسے صرف ایک کھیل ہی سمجھتے"

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"جو کچھ ہو رہا ہے" صفیہ نے جواب دیا۔

میں نے اُسکی کمر میں ہاتھ ڈال کر اور اُسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا

"ہوا کیا ہے؟ صرف دو دل آپس میں مل رہے ہیں"

"لیکن آپ نے کبھی انجام پر بھی نظر کی" صفیہ نے پوچھا۔

"انجام!" میں نے کہا" یہی کہ زندگی کے یہ چار دن مزے سے بسر ہو جائیں گے"

"سُنئے!" صفیہ بولی" آپ کی محبت نے مجھے آپ سے وہ بات کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جو میں نے آج تک آپ سے چھپائے رکھی۔ میری ماں

کے بطن سے پے در پے تین بیٹے ہوئے لیکن تینوں سال سال بھر کے ہونے کے بعد مر گئے۔ آخر میری ماں نے منت مانی کہ اب اگر بچی پیدا ہوئی تو وہ اُسے شاہسوار کی نذر کر دے گی اور ....."

"لیکن!" میں نے بات کاٹ کر پوچھا "یہ شاہسوار ہے کون؟"

"گاؤں والوں میں مشہور ہے کہ ان پہاڑوں میں کسی زمانے میں ایک درویش رہتا تھا۔ اپنی ساری عمر اُس نے عبادت میں گذاری اُس نے قسم کھا رکھی تھی کہ زندگی بھر عورت کی شکل نہ دیکھوں گا۔ وہ دن بھر غاروں اور جنگلوں میں چھپا رہتا۔ صرف رات کو باہر نکلتا۔ آخر وہ بہت ضعیف ہو گیا۔ ایک روز گوالوں کا ایک ڈیرہ اس جنگل میں آیا۔ ایک جوان لڑکی جو خاصی قبول صورت تھی اُس جگہ جہاں وہ عابد رہتا تھا جا نکلی۔ اُس لڑکی کو دیکھتے ہی بوڑھے کو افسوس ہوا کہ اس نے اپنی ساری عمر ضائع کر دی اور زندگی کا لُطف نہ اُٹھایا۔ اُس نے ایک آہ بھر کر کہا کہ آج اگر اُسے کوئی چند دن کے لئے گئی ہوئی جوانی دیدے تو وہ اپنی تمام عمر کی عبادت اُس کی نذر کر دیگا۔ اِدھر یہ الفاظ اُس کے منہ سے نکلے۔ اُدھر ایک خبیث روح اُس کے پاس آئی اور ابدی جوانی کے بدلے اُس سے عُمر بھر کی عبادت لے لی۔ یہ شاہسوار اصل میں وہی عابد ہے جس عورت کے گھر بچہ ہو کر مر جاتا ہے وہ ایک بچہ اُس کی نذر کرنے کی منت مانتی ہے جب کوئی عورت اس قسم کی منت مانتی ہے تو عموماً اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ اور جب یہ لڑکی جوان ہوتی ہے تو یہ شاہسوار کسی نہ کسی طرح اُسے لے جاتا ہے۔"

"کہاں لے جاتا ہے" میں نے ہنسکر پوچھا۔

"ہنسئے نہیں آپ!" صفیہ بولی۔ "ایک مدت سے یہاں ایسا ہی ہو رہا ہے۔"

"کیا لڑکی کہیں غائب ہو جاتی ہے" میں نے پوچھا۔

"غائب کہہ لیجئے یا کچھ اور" صفیہ بولی۔ "بہرکیف شاہسوار اپنی منت کی چیز لے ہی جاتا ہے۔"

"کبھی کوئی ایسی لڑکی جو یوں غائب ہو گئی ہو، پھر کبھی کسی کو ملی بھی؟" میں نے پوچھا۔

"آج تک تو نہیں" صفیہ نے جواب دیا۔

"تو تمہاری پریشانی کا بھی یہی باعث ہے" میں نے اُسے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے پوچھا۔

صفیہ نے جواب دینے کی بجائے سر جھکا لیا۔ میں نے کہا۔

"صفیہ! ڈرو نہیں۔ اگر شاہسوار نے ہمارے معاملہ میں کبھی دخل دیا تو یہ سودا اُسے مہنگا پڑیگا۔"

"نہیں نہیں!" اُس نے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لئے ایسا مت کہئے۔"

"تم تو پگلی ہوئی ہو" میں نے کہا۔ "محض وہم ہے تم لوگوں کا۔ گھبراؤ نہیں سمجھ لوں گا میں اُس سے۔"

یہ الفاظ میرے مُنہ سے نکلے ہی تھے کہ عقب سے کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں نے پلٹ کر دیکھا لیکن ایک پہاڑی کوّے کے سوا اُس پاس کوئی چیز نظر نہ آئی تاہم صفیہ نے خوف سے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

سورج اونچے اونچے پہاڑوں کے عقب میں چھُپ چُکا تھا اور فضا میں اُداسی چھا رہی تھی۔

میاں شیر علی گوالے کی غمازیاں اور ریشہ دوانیاں اب اپنا رنگ لا رہی تھیں۔ اب جو میں کبھی گاؤں میں سے گذرتا تو لوگ اُنگلیاں اُٹھاتے۔ اُدھر صفیہ کو اُس کی سوتیلی ماں نے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ شاہسوار کے خوف سے صفیہ گو کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی لیکن میری تسلیوں اور دلداریوں نے کچھ اُس کی ہمت بھی بندھا دی تھی۔ اُسے کچھ یقین سا ہو چلا تھا کہ شاہسوار اُسکا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میری باتوں سے اُس کی کچھ تسلی سی ہو چلی تھی کہ شاہسوار محض اُس کے وہم کی پیدا کردہ چیز ہے۔ آخر ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ صفیہ نے ایک روز خود ہی مجھ سے گاؤں چھوڑ دینے کا ذکر کیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں نے اُسی روز اپنا بوریا بستر باندھ لیا۔ راستہ اُسی نیل سر کے پاس سے گذرتا تھا جس روز چلنے کا ارادہ تھا میں نے اُس سے ایک روز پیشتر ہی اپنا اسباب روانہ کر دیا۔ صفیہ نے مجھ سے نیل سر کے پاس ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

چاندنی رات تھی۔ شجر حجر چاندی میں ملبوس نظر آتے تھے۔ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی تھی۔ ہر چیز چمک رہی تھی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں، سر فلک پہاڑ۔ دیو قامت اشجار اور سبزہ زار دریائے نور میں نہائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ لنڈ منڈ درخت جس پر شاہین شام کے وقت بیٹھا کرتا تھا۔ اس ویرانے میں کسی سپید پوش کی طرح خاموش کھڑا تھا اور نیل سر کا پانی سیماب کی طرح چمک رہا تھا۔ چاروں کھونٹ خاموشی اور سکوت چھایا ہوا تھا اور کہسار کی چوٹیاں اس میں اس طرح جھکی ہوئی نظر آتی تھیں جیسے بادہ خوار صبوحی پینے کو جھک جھک کر ہاتھ بڑھا رہے ہوں۔ اور اس سلسلۂ کوہستان کی وہ سر بلند چوٹی جس پر گاؤں والوں کے عقیدہ کے مطابق شاہسوار کا مسکن تھا بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔

میں صفیہ کے انتظار میں کبھی جھیل کے کنارے ٹہلنے لگتا۔ کبھی پتھر پر بیٹھ کر گنگنانے لگتا۔ آخر وہ جان تمنا سامنے سے آتی نظر آئی۔ وہ کبک کی طرح رقص کرتی چلی آ رہی تھی۔ وہ سنبل کی طرح لچک لچک کر قدم اٹھا رہی تھی جیسے کوئی گھر سے سیر کرنے کو نکلا ہو۔ وہ ابھی مجھ سے کچھ فاصلہ پر ہی تھی کہ میں نے آواز دی

"صفیہ!"

"آ گئی!" اس نے جواب دیا۔

وہ میری طرف بڑھ رہی تھی اور میں اس کی طرف میں نے راستے ہی میں اُسے جا لیا۔

"ذرا جلدی قدم اُٹھاؤ" میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "رات کا سفر ہے۔ اور منزل دُور ہے"

وہ ہنسکر بولی۔

"جب آپ ساتھ ہیں تو منزل کی دُوری کیسی؟"

"صفیہ! میں نے بھی ہنسکر کہا۔ "صبح جب شیرو کو تمہارے چلے جانے کا علم ہوگا تو خوب پیچ و تاب کھائیگا"

"کس منحوس کا آپ ذکر لے بیٹھے" صفیہ نے جواب دیا۔

اس وقت ہم اُس پتھر کے پاس سے گذر رہے تھے۔ جہاں اُس نے پہلی بار مجھ سے اقرار محبت کیا تھا۔

"آیئے!" وہ ہاتھ تھام کر بولی۔ "ذرا اس سے بھی رخصت ہولیں"

"کس سے؟" میں نے پوچھا

"اُس پتھر سے" صفیہ ہنسکر بولی۔ "یہی تو ہماری محبت کا پہلا شاہد ہے"

ہم دونوں اُس پتھر پر جا بیٹھے۔ لیکن پتھر کسی بے وفا حسینہ کے دل کی طرح ٹھنڈا تھا۔ ہمارا عکس نیل سر میں پڑ رہا تھا۔ نیل سر کے پانی میں ننھی ننھی سی لہریں اُٹھ رہی تھیں اور ہم دونوں کے سائے جھومتے نظر آرہے تھے۔

صفیہ ہنسکر بولی

"دیکھئے نا! آج نیل سر بھی ہمیں جھولا جھلا رہی ہے۔"

"جھولا کیسے نہ جھلائے!" میں نے صفیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اور اُسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "ہمیں مسرور دیکھ کر وہ بھی مسرور ہو رہی ہے۔"

صفیہ ہنسکر بولی

"دیکھئے نا! کیا چاندنی کھلی ہے۔"

اور میں نے اُسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"چاندنی نہیں! یہ تو تمہارے حُسن کی بارش ہو رہی ہے۔"

اُسوقت صفیہ کوہستان کی اُسی سربلند چوٹی کی طرف جس نے برف کی قبا پہن رکھی تھی دیکھ رہی تھی۔ اچانک اُس کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ خوف سے کانپتی ہوئی میرے سینے سے چمٹ گئی۔

"کیا ہے؟" میں نے پُوچھا "صفیہ! ڈر گئیں کیا؟"

"وہ دیکھو! وہ دیکھو!" اُس نے اُسی برف پوش چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی نہیں وہاں تو!" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "اُٹھو چلیں۔"

"آپ دیکھتے تو ہیں۔" صفیہ نے خوفزدہ آواز سے کہا "وہ دیکھئے! وہ!"

"کون ہے؟ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاہسوار!" اُس نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "وہ دیکھئے! وہ

نیچے آرہا ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور خوف سے اُس کے پسینے چھوٹنے لگے۔

اب میں نے بھی دیکھا۔ ہاں! اسی برف پوش چوٹی کی طرف سے ایک سیاہ پوش آدمی جو سیاہ گھوڑے پر سوار تھا نیچے آرہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور جہاں گھوڑے کا قدم پڑتا وہاں سے چنگاریاں نکلتے لگتیں۔

اُسوقت میرے دل میں خوف بھی تھا اور غصہ بھی۔ شاہسوار پہاڑ سے اُتر کر نیل سر کی طرف آرہا تھا۔ اور صفیہ خوف سے نیم جان بنی میرے سینے سے چمٹی ہوئی کانپ رہی تھی۔ وہ سیاہ پوش جھیل کے کنارے آکر رُک گیا۔ اب وہ ہماری طرف دیکھ رہا تھا میں نے غصہ سے چلّا کر کہا۔

"ملعون دور ہوجا!"

اس کا جواب گھوڑے کا ہنہنانا تھا لیکن کیسا ہنہنانا۔ جیسے سینکڑوں خبیث ارواح چلا رہی ہوں۔ یہ آواز سنتے ہی صفیہ میری آغوش سے اُٹھی۔

"کہاں چلی صفیہ!" میں نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"چھوڑ دیجئے مجھے!" صفیہ میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

"کہاں جاؤ گی؟" میں نے اُسے روکتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھتے نہیں آپ!" وہ ذرا غصّے سے بولی۔ "وہ مجھے بُلا رہا ہے۔"

"صفیہ ہوش کرو" میں نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "آنکھیں تو کھولو صفیہ!"

لیکن میرے روکنے کے باوجود وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور جھیل کی طرف چلی میں نے اُسکا ہاتھ پکڑ لیا لیکن اُس نے غصّے سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

صفیہ! میں نے پھر اُسے روکتے ہوئے کہا۔ "ہوش کرو۔ آنکھیں تو کھولو!"

لیکن اُسوقت اُس میں بلا کی طاقت معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے مجھے ایک ہاتھ سے پیچھے دھکیل دیا۔ اور نیل سر میں چھلانگ لگا دی۔ میرے دیکھتے دیکھتے جھیل نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کنارے پر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے دوسرے کنارے سے ایک قہقہے کی آواز سُنائی دی میں نے سر اُٹھا کر جو دیکھا تو صفیہ شاہسوار کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھی قہقہے مار رہی تھی میں بے تحاشا دوسرے کنارے کی طرف بھاگا لیکن ٹھوکر کھا کر گرا۔ کب اُٹھا کیسے اُٹھا۔ کتنی دیر پتھروں پر پڑا رہا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن ہوش اسوقت آیا جب شاہین کی کرخت آواز فضا میں گونج رہی تھی۔

صبح کا سہانا وقت تھا نیل سر کا پانی بلور کیطرح چمک رہا تھا۔ برف پوش چوٹی پر سیاہ بادل چھایا ہوا تھا لیکن اس سیاہ بادل کی شکل ایک گھوڑے کی طرح تھی۔ اور اُس گھوڑے پر صفیہ اور وہ خبیث سیاہ پوش دونوں سوار تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ سیاہ بادل آسمانوں کی وسعت میں غائب ہو گیا۔

★

16499

گواہ

گواہ

یوں تو پندرہ سال کی بات بھلا کون یاد رکھتا ہے۔ لیکن دل میں اگر پریم ہو تو پندرہ سال کی تو کچھ حقیقت ہی نہیں اگر قرن بھی گذر جائیں تو بات نہیں بھولتی۔

پنڈت وشنوناتھ اور میں کالج میں پڑھتے تھے۔ اور جو میں یہ کہوں کہ کالج میں صرف وہی ایک میرا دوست تھا تو آپ اُسے غلط نہ سمجھئے۔ ایک گروپ میں وہ تھا۔ دوسرے میں میں۔ اور لطف یہ کہ دونوں گروپ کے طلبا میں ہمیشہ نوک جھونک رہتی۔ وہ ہاکی ٹیم کا کپتان، میں ڈی بیٹنگ کلب کا سکریٹری۔ پنڈت گھاس پات کھانے والا، اور میں گوشت خور۔ وہ پوجا پاٹ کا پکا، اور میرے یہاں اللہ کا نام۔ مجھے سیر تماشا کا مرض۔ وہ کتاب کا کیڑا۔ وہ بورڈر میں گھر والا۔ گویا دو متضاد کیفیتوں کے ہوتے ساتے پنڈت کو مجھ سے اتنا

پریم تھا کہ دیکھنے والوں کو رشک ہوتا۔

ابھی ڈگری اگزیمنشن میں چھ سات مہینے باقی تھے کہ وشنواناتھ کو باپ کے سرگباش ہونے کی خبر ملی اور وہ اُسی روز گاؤں واپس چلا گیا۔ گیا تو وہ چند روز کے لئے لیکن پندرہ سال گذر گئے اور پنڈت کی کوئی خبر نہ ملی۔

نومبر کا مہینا تھا اور میں شکار کے لئے ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں مقیم تھا۔ صبح ہوتے ہی تھیلے میں بیٹھکر شکار کے لئے نکل جاتا اور شام کو واپس لوٹ آتا۔ اس اسٹیشن سے کوئی پانچ سات میل پر ایک بہت بڑی بستی تھی۔ آبادی ہندوؤں کی تھی۔ گو شکار بکثرت ملتا لیکن بستی کے آس پاس ہندو لوگ شکار کرنے نہ دیتے تھے۔ اور بستی والوں ہی کی بات نہیں کھیتوں والے بھی عموماً کھیتوں میں شکار کرنے سے روکتے۔

گو مجھے اپنے اہل وطن کی اس پست ذہنیت پر افسوس تو بہت ہوتا لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ یہاں تو وہ بات تھی کہ لنکا میں جو کوئی سو باون گز کا۔ لیکن ریلوے اسٹیشن کے دوسری جانب میلوں تک ویرانہ تھا کہیں ریتلے میدان۔ کہیں گھاٹیاں، اور کہیں جھاڑیوں کے جھنڈ۔ یہاں شکار بھی بہت ملتا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہ تھا۔ اسٹیشن ماسٹر تھا تو ہندو ہی لیکن بہت خلیق اور آزاد خیال آدمی تھا۔ روٹی تو میرا نوکر پکا لیتا اور دودھ مکھن اسٹیشن ماسٹر کے یہاں سے آجاتا۔ اس زمانے میں ایسے لوگ بہت غنیمت ہیں۔

یہاں شام کے بعد کوئی آٹھ بجے کے قریب ایک مسافر گاڑی آتی تھی ایک روز گاڑی آنے کے وقت میں پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ آج گاڑی کچھ لیٹ تھی۔ دس بیس مسافر جانے والے تھے۔ کچھ تو اپنے اسباب کے پاس بیٹھے گاڑی کی راہ دیکھ رہے تھے۔ کچھ سر اٹھا اٹھا کر جدھر سے گاڑی آنیوالی تھی ادھر جھانک رہے تھے۔ دو چار تار بابو کے کمرے کے سامنے کھڑے تار کی ٹک ٹک غور سے سن رہے تھے۔ تیل کے پکوڑے اور پیسے کے دو دو بسکٹ والے کی آج اچھی بکری ہو رہی تھی۔ سگرٹ بیڑی والا بھی مسافروں کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔ اتنے میں گاڑی آتی نظر آئی۔ سب چاک چوبند ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ادھر گاڑی پلیٹ فارم پر رکی۔ ادھر مسافر سوار ہونے کے لئے لپکے۔ اب کوئی سوار ہونے کے لئے زور مار رہا ہے۔ کوئی اترنے کے لئے جلدی کر رہا ہے۔ مختلف قسم کی آوازیں آنے لگیں "ارے بھائی دروازہ تو کھولو۔" "اجی ہٹو سامنے سے!" "ٹھہرو جی! پہلے اپنا اسباب اتار لیں گے پھر کسی کو سوار ہونے دیں گے۔" "چلو آگے۔ یہاں تو تل دھرنے کی جگہ نہیں تم کہاں گھسنے لگے؟" "ابے او پکوڑے والے! بھاگ ادھر۔ اے دیکھائیو ایک پیسے کی بیڑی ادھر بھی۔ چچا جی رام رام۔ اچھا بھیا رام رام۔ کھت لکھیو جاتے ہی۔ ہاں جرور۔ جرور۔" پھر گھنٹی کی ٹن۔ پھر گاڑی کی سیٹی۔ پھر گاڑی کی آواز۔ گاڑی جاتا ہے۔ دروازہ بند کرو۔ پھر شٹ فٹ۔ اور گاڑی یہ جا وہ جا!

میں ایک طرف کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ پلیٹ فارم کے اگلی جانب سے

ایک نوجوان اور اُس کی بیوی آتے دکھائی دیئے۔ لباس سے دونوں معزز اور خوشحال معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے عقب میں ایک نوکرانی تھی جو ایک بچے کو اُٹھائے تھی اور اس کے پیچھے دو مزدور اسباب اُٹھائے چلے آرہے تھے۔ یہ نوجوان مسافر دو چار قدم چلکر اپنی بیوی کی طرف جو پیچھے گھونگھٹ نکالے چلی آرہی تھی مڑکر دیکھ لیتا۔ جب وہ میرے پاس سے گذرا تو اُس نے سر اُٹھاکر میری طرف دیکھا۔ پھر ٹکٹ بابو کے پاس دروازے پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ اس وقت اُسنے پھر ایکبار میری طرف دیکھا لیکن اتنے میں اُسکی بیوی اور بچہ بھی آگئے۔ اور وہ ٹکٹ دیکر دروازے سے باہر نکل گیا۔ اور میں بھی ٹکٹ بابو کے پاس آکھڑا ہوا۔ اُسوقت لمپ کی روشنی میرے چہرے پر پڑرہی تھی۔ وہ نوجوان اور اُسکی بیوی اسٹیشن کی سیڑھیوں پر کھڑے اپنے اسباب کا انتظار کررہے تھے۔ اُس نوجوان نے پھر ایک بار پلٹ کر دیکھا لیکن مجھ پر نگاہ پڑتے ہی کچھ ٹھٹک سا گیا لپک کر میرے پاس آیا اور میرا نام لیکر بولا۔

"شاید میں غلطی تو نہیں کررہا"

"نہیں! میں نے مُسکراکر کہا

یہ میرا دوست پنڈت وشنو ناتھ تھا۔ پنڈت بڑے تپاک سے مجھ سے بغلگیر ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ محبت اور اخلاص کے آنسو! ہنسکر بولا۔

"میں پہلی ہی نظر میں پہچان تو گیا تھا لیکن مجھے آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔

تم یہاں کہاں"۔

میں نے ہنسکر کہا

"تمہاری کشش کھینچ لائی"۔

"اسی گاڑی سے آئے ہو"۔ پنڈت نے پوچھا۔

ٹکٹ بابو بولا۔

"یہ تو تین چار روز سے مسافر خانے میں مقیم ہیں"۔

"مسافر خانے میں؟" پنڈت نے تعجب سے کہا۔"کیوں؟"

میں نے مسکرا کر کہا

"کہہ جو دیا تمہاری کشش کھینچ لائی یہاں۔ تم نے تو بھول کر بھی یاد نہ کیا"۔

"چلو!" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔"تمہارا اسباب کہاں ہے؟"

پاس سے ٹکٹ بابو نے پوچھا

"آپ کے دوست ہیں؟"

"بھائی!" پنڈت نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔

"اب تم جاؤ۔ صبح ملیں گے"۔

"تم ادھر تو آؤ"۔

پنڈت مجھے اُس جگہ جہاں اُسکی بیوی کھڑی تھی لے آیا اور بیوی

سے مخاطب ہو کر بولا

"بملا! یہی وہ میرے بھائی ہیں جن کا میں تم سے کئی بار ذکر کر چکا ہوں"

بملا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے سلام کیا

"بھابی!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اچھی ہو"

"دیا ہے آپ کی" بملا نے ہولے سے جواب دیا۔

وشوا ناتھ نے نوکرانی کی گود سے بچہ لیکر اور اسکا ننھا سا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ کر کہا۔

ابے! چچا کو سلام تو کر۔"

میں نے بچہ گود میں لے لیا۔

ایک نوکر پاس آکر بولا۔

"جناب! اسباب تو پہلے ہی باندھ دیا تھا"

پنڈت بولا۔

"ان کا اسباب بھی اٹھا لاؤ"

پھر مجھ سے۔

"کہاں ہے اسباب تمہارا؟

میں نے کہا

"صبح ملیں گے۔ تم جاؤ اب"

بملا بولی

"بھائی! آپ بھی چلئے نا۔ آپ کیوں نہیں چلتے۔ اپنا ہی تو گھر ہے۔"
میں نے کہا
"میں تو عرض کر رہا ہوں کل چلوں گا۔ آپ کو دیر ہوتی ہے آپ جائیے اب۔"
اور پنڈت نے ہنسکر کہا
وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے!
تو قصہ مختصر پنڈت یہ کہہ کر کہ وہ صبح صبح بہلی لیکر آئیگا مجھ سے رخصت ہوا۔

اگلے روز میں ابھی نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ پنڈت آگیا۔ اور آتے ہی میرا اسباب بندھوا کر بہلی پر رکھوایا۔ اور ہم سوار ہو کر گاؤں کی طرف چلے۔ بہلی کی سواری کچھ اتنی بُری نہیں۔ بہلی میں نگوری بیل جُتے ہوئے تھے سینگوں پر چاندی کی سونگوٹیاں تھیں۔ گلے میں گھنگرو تھے۔ پاؤں میں جھانجھنیں تھیں بہلی کے بازوؤں میں بھی جھانجھ پڑے ہوئے تھے بیٹھنے کے لئے نرم گدیلے تھے اور مخمل کے چھوٹے چھوٹے تکیے پیٹھ کے پیچھے رکھنے کو۔ بیلوں کے گلے میں سُرخ ریشم کی ڈوری تھی اور بہلی والے کی سُرخ پگڑی۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ راجہ جی کی سواری جا رہی ہے۔

"پنڈت!" میں نے ہنسکر کہا۔ "ایک تو اتنی شورا شوری اور ایک اتنی بے تکی۔ آخر تمہیں ہوا کیا جو تم نے خط تک نہ لکھا؟"

"میں جس بندھن میں بندھا رہا اب تمسے کیا کہوں"۔ پنڈت نے جواب دیا "بھائی جب زمانے کی ہوا بدلتی ہے تو پھر کچھ سوجھ نہیں پڑتا"۔

"گویا!" میں نے ہنسکر کہا "بہت مشکلیں ....."

اور پنڈت بات کاٹ کر بولا "ہاں! ع

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

میں نے کہا

"پھر بھی خیر خیریت لکھنے کی بھی سُدھ بُدھ نہ رہی تمہیں"

"خط لکھنے کو تو کئی بار دل چاہا اور رملا نے بھی کئی بار کہا لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا ندامت سے ہمت نہ پڑی"۔

"شادی کب کی؟" میں نے پوچھا۔

"دو سال ہو گئے" پنڈت نے جواب دیا۔

"یہی ایک بچہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو یہی ہے" پنڈت نے مسکرا کر کہا۔

کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے ہم گاؤں کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے ہنس کر کہا۔

"پنڈت! کسی سے پٹوا نہ دینا"

پنڈت نے میری طرف تعجب سے دیکھا۔ میں نے کہا

"بھئی! میں ٹھہرا شکاری آدمی۔ صبح سے شام تک جی ہتیا میرا شغل۔ تم

لوگ کٹر ہندو۔"

"کسی کی مجال ہے۔" پنڈت بولا۔ "جو تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے جانتے بھی ہو میں یہاں سول مجسٹریٹ بھی ہوں۔ چاروں کھونٹ جاگیر سمجھو۔"

پنڈت کا مکان یا حویلی بستی سے ذرا ہٹ کر تھی۔ یہ ایک پرانے وقتوں کی شاندار عمارت تھی کسی راجہ کا محل معلوم ہوتا۔ پائیں باغ بھی تھا۔ پنڈت نے مجھے مردانے میں ٹھہرایا۔ چائے بملا خود لیکر آئی۔ چائے کے بعد میرے کھانے کا سوال اُٹھا۔

بملا بولی

"بھائی جی کے لئے پوریاں میں تل دیا کروں گی۔ بھاجی گھر میں پکتی ہی ہے۔"

پنڈت ہنسکر بولا۔

"بملا! گوشت خور کو بھاجیاں کھلاؤ گی تو شام سے پہلے ہی بھاگ جائے گا۔"

"کیوں بھاگیں گے؟" بملا بولی۔ "گوشت نہیں پک سکتا کیا؟"

"تم پکاؤ گی؟" پنڈت نے مسکرا کر پوچھا۔

"بھائی جی بتلا دیں گے تو پکا دوں گی۔" بملا نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

"دھرم بھرشٹ نہ ہو جائیگا تمہارا۔" پنڈت نے ہنسکر پوچھا۔

اور بملا نے بھی ہنسکر جواب دیا۔
"بھائی کی سیوا بھی دھرم کی سیوا ہے"۔
میں نے ہنسکر کہا
"پوریاں تو میں ضرور کھاؤں گا۔ اور بھاجی بھی۔ باقی رہا گوشت تو میرا نوکر پکالیا کرے گا"۔
"میرے یار! پنڈت ہنسکر بولا" برہمن کے گھر بیٹھکر جی ہتیا کروگے۔ بڑے ظالم ہو تم"۔

مجھے پنڈت کا مہمان ہوئے تین چار روز ہو چکے تھے۔ دونوں میاں بیوی دن بھر میری خاطر و مدارات میں لگے رہتے۔ کبھی حلوے تلے جا رہے ہیں۔ کبھی مٹھائیاں بن رہی ہیں کہیں بڑی تیار ہو رہی ہے۔ دہی بڑے۔ پوریاں کچوریاں۔ حلوا۔ چار پانچ قسم کی بھاجیاں۔ دو چار قسم کے اچار چٹنی اور ایک مرغ مسلم دونوں وقت کھانے پر آتا ہیں کھانے پر بیٹھتا تو پنڈت پاس بیٹھ کر مکھیاں ہلاتا۔ اور بملا غریب بھاگی بھاگی جاتی اور گرم گرم پوریاں لاتی۔
دو دن کو دیوالی کا تہوار تھا۔ بملا نے تہوار منانے کا بہت اہتمام کیا دیوالی کے روز گھر میں بڑی چہل پہل رہی۔ ملنے جلنے والیاں مٹھائی کے تھال لیکر بملا کے پاس آتی جاتی رہیں کئی ایک جگہ بملا نے بھی مٹھائی بھجوائی میرے لئے بھی بہت اہتمام سے کھانا تیار کر دیا گیا۔ مچھیوں کا پلاؤ بہت مزا

تھا۔ آج بملا نے مجھے اتنی مٹھائی کھلادی کہ میں نے ہار مان لی۔ شام کے وقت وہ ایک بہت قیمتی ساری پہنے اور سونے میں لدی ہوئی اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں لئے میرے پاس آئی اور بچے کے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر مجھے سلام کروایا۔ میں نے ننھے کو گود میں لے لیا اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اُس کے ننھے ننھے ہاتھوں میں تھما دیا۔ پھر وہ پوجا پاٹ کو چلی گئی۔

آج گاؤں میں بہت دیوٹ مالا کی گئی۔ غریب کی جھونپڑی سے لیکر امیر کے کاشانے تک دیوٹ مالا سے جگمگا اُٹھے۔ پنڈت نے محض میری خاطر سے بہت سی آتشبازی منگوائی تھی۔ نو بجے رات سے لیکر دس بجے تک آتشبازی چھوٹتی رہی۔ آتشبازی دیکھنے کے لئے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ مکان کے سامنے لگ گئے۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب پنڈت زنانے میں چلا گیا۔ اور میں سونے کے لئے پلنگ پر جا لیٹا۔ اور جلدی ہی ہرنوں اور چکاروں کے خواب دیکھنے لگا۔

نہ جانے کیا وقت تھا کہ اچانک مجھے کسی نے جھنجھوڑ کر جگایا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن غسلخانے میں سے لمپ کی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ اس دھیمی دھیمی روشنی میں مجھے کمرے میں کسی کا سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔ پھر یہ سایہ اس جگہ جہاں غسلخانے کے لمپ کی روشنی

پڑ رہی تھی۔ آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک جوان عورت تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے یہ عورت غسلخانے کی طرف گئی اور لمپ اُٹھا لائی۔ بہت حسین عورت تھی کسی نگدارہ ریشم کا لہنگا تھا قمیص کی بجائے بدن پر "چولی" تھی لیکن بہت شوخ رنگ کی۔ سینے کا اُبھار چولی کے اندر سے پھوٹ پھوٹ پڑتا۔ سر پر باریک دوپٹہ تھا ماتھے پہ بندیا۔ کانوں میں بندے گلے میں ہار۔ اور خوبصورت کلائیوں میں پتلی پتلی چوڑیاں۔ ہیروں اور موتیوں سے جگمگاتی ہوئی۔ سراپا حُسن اور نزاکت کی موہنی تصویر تھی، جو میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی اور میں صورت یہ خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پلنگ پر سے اُٹھایا۔ پھر اسی طرح مجھے حویلی کے اس حصّے کی طرف لے گئی جو عموماً بند رہتا تھا۔ دو تین کمروں سے گذر کر ہم ایک زینہ پر پہنچے۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ آگے آگے میں پیچھے پیچھے جب ہم زینے سے اُترے تو سامنے ایک وسیع کمرہ تھا۔ اُس کا فرش پتھر کا تھا کچھ پرانی قسم کا سامان اِدھر اُدھر رکھا تھا۔ دیواروں پر بہت خوبصورت تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں ایک شمعدان تھا اس کی روشنی کمرے کی سب چیزیں نظر آرہی تھیں۔ کمرے کے آخری سرے پر کسی جگہ پتھر کی ایک بارہ دری سی تھی۔ بارہ دری کی چھت سے سونے یا پیتل کا بہت خوبصورت شمعدان لٹک رہا تھا۔ اُس میں کوئی خوشبودار چیز جل تھی۔ کمرے میں روشنی بھی اُس سے پھیل رہی تھی اور خوشبو بھی۔ میرا جسم

مجھے ایک بھدّی سی چوکی پر بٹھا کر بارہ دری کی بغل میں جو دروازہ تھا اس کے اندر چلا گیا۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ جیسے کسی نے جادو کر کے بٹھا رکھا ہو۔ اتنے میں اس وسیع کمرے کے کسی دروازے سے جو میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا ایک بھاری بھرکم آدمی بہت فاخرہ لباس اور جواہرات پہنے نکلا۔ اس کے پیچھے دو خادم تھے جو ایک اور شخص کو دونوں بازوؤں سے پکڑے ساتھ لا رہے تھے۔ بظاہر کوئی ملزم معلوم ہوتا تھا۔ یہ فاخرہ لباس والا آدمی اس بارہ دری میں آکر بیٹھ گیا۔ اور اس کے دونوں ساتھ والے اس تیسرے آدمی کو درمیان میں لیکر بارہ دری کی بائیں طرف کھڑے ہو گئے۔ پھر وہی حسین عورت دو باندیوں کو ساتھ لئے اسی بغلی کمرے سے نکلی۔ ایک باندی کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا۔ یہ تینوں عورتیں بارہ دری کی دائیں جانب کھڑی ہو گئیں اور باندی نے جس کی گود میں بچہ تھا بارہ دری والے آدمی کے قدموں کے پاس رکھ دیا۔

اب اس فاخرہ لباس والے نے اس آدمی کی طرف جسے اس کے نوکر پکڑے کھڑے تھے دیکھا اور اس سے کچھ کہا جو میں سمجھ نہ سکا۔ اُس آدمی نے آگے بڑھ کر پہلے اُس فاخرہ لباس والے کے پاؤں کو بوسہ دیا۔ پھر اُس حسین عورت اور بچے کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ جب وہ کہہ چکا تو اُس فاخرہ لباس والے نے خشمگیں نگاہوں سے حسین عورت کی طرف دیکھا اور غصّے سے کچھ کہا۔ پھر کمر سے ایک آبدار خنجر نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔ اُس حسین عورت نے خنجر لے لیا۔ پھر وہ آگے بڑھی۔ اور بچے کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ کچھ دیر

وہ اُسے پیار کرتی رہی۔ اُس فاخرہ لباس والے نے ڈانٹ کر کچھ کہا عورت نے قہر آلود نگاہوں سے ملزم کی طرف دیکھا اور اچانک بچّے کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ ساتھ ہی وہ غش کھا کر گری لیکن باندیوں نے اُسے سنبھال لیا اور اُٹھا کر اُسی بغلی کمرے کی طرف جہاں سے وہ آئی تھیں لے گئیں۔ فاخرہ لباس والا غصّے سے گرجتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھا اور جھک کر بچے کے ننھے سے سینے سے خنجر نکالا اور نوکروں کو اشارہ کیا انھوں نے ملزم کو پچھاڑ کر زمین پر لٹا دیا اور اُس فاخرہ لباس والے نے اس کے سینے پر سوار ہو کر اسے قتل کر ڈالا۔ یہ دوسرا خونی منظر دیکھ کر مجھے غش آگیا

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ پنڈت۔ بملا۔ ایک ڈاکٹر اور ایک بوڑھا سا دھوبی پلنگ کے اِدھر اُدھر بیٹھے تھے۔

"کیا حال ہے؟" میرے دوست نے پوچھا۔

"اچھا ہوں!" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "کیا ہوا؟"

بملا اُٹھ کر پلنگ کے پاس آئی اور جھک کر بولی۔

"بھائی جی! کیسی طبیعت ہے؟"

"اچھا ہوں بملا" میں نے مسکرا کر کہا "ہے کیا؟"

"اُٹھئے!" بملا بولی "یہ کپڑے اُتار ڈالئے!"

"کیوں؟" کہتے ہوئے میں نے کپڑوں پر جو نظر ڈالی تو قمیص پر خون کے

دھبے نظر آئے۔ یہ خون کہاں سے آیا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ اور اُٹھکر بیٹھ گیا۔

پنڈت ہنسکر بولا۔

"کوئی ہرن مارا ہوگا۔ اُسی کا خون معلوم ہوتا ہے"

میں نے پنڈت کیطرف تعجب سے دیکھا۔ وہ ہنسنے لگا۔

"یہ کیا گذری تم پر؟" میرے دوست نے پوچھا۔

"بات کیا ہے؟" میں نے کہا

وہ سادھو اپنی جگہ سے اُٹھا اور پلنگ کے پاس آبیٹھا میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولا۔

"بیٹا! تم وہاں گئے کیسے؟"

مجھے رات کا واقعہ یاد آگیا اور جو کچھ میں نے دیکھا تھا ان لوگوں سے کہدیا۔ میرا دوست بولا۔

"لیکن سیڑھیوں کے دروازے میں تو قفل پڑا ہوا تھا"

"قفل پڑنے سے کیا ہوتا ہے" بوڑھے سادھو نے کہا۔ پھر میرے دوست کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

"پنڈت جی! آپ کے دوست نے جو کچھ کہا۔ بالکل سچ ہے۔ اس حویلی کے متعلق ہم بھی اپنے بزرگوں سے یہی بات سنتے چلے آئے ہیں۔ اور دیوالی کی رات کوئی نہ کوئی شخص یہ تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھتا بھی ہے۔ کسی زمانے میں اس

حویلی میں ایک ٹھاکر رہتا تھا۔ کوسوں تک اُسی کی جاگیر تھی۔ ٹھاکر بڑا جابر آدمی تھا۔ یہ حسین عورت جو آپ کے دوست کو ساتھ لے گئی اُس کی چوتھی رانی تھی ٹھاکر بڑی عمر کا آدمی تھا۔ اور رانی جوان۔ پہلی تین جوروؤں سے ٹھاکر کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس رانی سے بھگوان نے اُسے ایک بیٹا عطا کیا۔ ٹھاکر کا بھتیجا جو اُس کے بعد جاگیر کا وارث بننے والا تھا۔ اصلی وارث کے پیدا ہونے سے رانی کا دشمن بن گیا۔ اور اس پر یہ الزام لگایا کہ یہ بیٹا ناجائز تعلق کا نتیجہ ہے۔ ٹھاکر یہ سن کر سناٹے میں آگیا۔ رانی نے ہر چند اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن ٹھاکر کے بھتیجے کے سامنے اس کی بات نہ چل سکی۔ اس پاجی نے ٹھاکر سے کہا کہ مہاراج! اگر رانی واقعی بے گناہ ہے تو یہ اپنے بچے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔ رانی یہ سُن کر کانپ اُٹھی۔ لیکن اپنی عصمت اور آبرو کی خاطر اپنے لختِ جگر کو ذبح کرنے پر تیار ہوگئی۔ اور شوہر سے خنجر لیکر سب کے سامنے اپنے بچے کو ذبح کر ڈالا۔ اب ٹھاکر کو اپنی رانی کے بے گناہ ہونے کا یقین آیا۔ اور غلط الزام لگانے کے جرم میں اپنے ہاتھ سے اپنے بھتیجے کو اُسی وقت قتل کر دیا۔ رانی شوہر کا گھر چھوڑ کر فقیر ہوگئی۔ اور پھر کبھی کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔ یہ تمام واقعہ دیوالی کی رات کو ہوا تھا۔ اور اب ہر سال ہر دیوالی کی رات غیر آدمیوں میں سے کوئی نہ کوئی شخص بطور گواہ یہ تماشا دیکھتا ہے۔ آپ کے دوست کے کپڑوں پر اُسی پاپی کے خون کی چھینٹیں پڑی ہوں گی۔

ممکن ہے میں نے کوئی خواب ہی دیکھا ہو۔ لیکن کپڑوں پر خون کی چھینٹیں پڑنے کا معمہ میں آج تک حل نہیں کر سکا۔

نقاد [illegible]

[illegible]

[illegible]

این قدر [illegible]

[illegible]

[illegible]

مستخلص [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

16499

سہیلی یا بیوی

Please keep off my

Way!!

[illegible]

You idiot!

You don't have shame..

It is not the place to

advertise an message

advertisement

[illegible] 10/11/05

سہیلی

"آخر آگ لگی کیسے؟" رضیہ نے شوہر سے پوچھا

"یہ تو آج تک نہ معلوم ہو سکا۔" نسیم نے جواب دیا۔ "اللہ کی رضا سمجھو۔"

رضیہ بولی۔

"منیرہ کو دیکھ کر زبیدہ کی بھولی بھالی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اللہ توبہ! کیا گذری ہوگی بیچاری پر۔"

"دم گھٹنے سے مر گئی غریب۔" نسیم نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "بھائی قدرت اللہ خدا انھیں جنت نصیب کرے اسی بچی کے دم سے جیتے تھے۔"

کچھ دیر دونوں میاں بیوی خاموش بیٹھے رہے۔ پھر نسیم نے پوچھا۔

"تو پھر اب صلاح کیا ہے؟ مرحوم کی وصیت کا احترام تو کرنا ہی پڑیگا"۔

"اگر مکان کرایہ پر دیدیں تو؟" رضیہ نے پوچھا۔

"لیکن بھائی تو یہ وصیت کر گئے ہیں کہ ہم اُس مکان میں اُٹھ چلیں"۔ نسیم نے جواب دیا۔

"نہ جانے!" رضیہ نے ذرا مسکرا کر کہا۔ "شہر کی زندگی ہمیں راس بھی آئے"۔

"تم یہ کہو" نسیم نے اپنی پیاری بچی منیرہ کی طرف جو ایک طرف بیٹھی اپنی گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ دیکھتے ہوئے کہا "منیرہ کو اپنی سہیلیوں سے جدا ہونا کتنا شاق ہوگا"۔

"یہ بھی تو ہے"۔ رضیہ نے جواب دیا۔ "منیرہ کی خوشی تو ہمیں سب سے مقدم ہے"۔

"بہرکیف" نسیم بولا "جانا تو پڑے ہی گا"۔

"اور یہاں کا انتظام؟" رضیہ نے پوچھا۔

"وہ بھی ہو جائیگا" نسیم نے جواب دیا۔ "تم اب چلنے کی تیاری کرو"

بھرا گھر چھوڑنا کچھ آسان نہیں"۔ رضیہ بولی۔ "بچوں کا کھیل نہیں کہ گڑیاں بغل میں دبائیں اور چل کھڑے ہوئے"۔

"اسباب تو سب ساتھ ہی جائیگا" نسیم نے کہا۔ "رہے ڈھور ڈنگر تو نوکر چاکر یہاں بھی تو ہوں گے وہ دیکھ بھال کرلیں گے۔ مہینے میں دو ایک بار میں خود بھی پھیرا ڈال جایا کرونگا۔ شہر والی جائداد کا بھی تو انتظام کرنا ہے آخر!"

"جیسے آپ کی مرضی" کہہ کر رضیہ گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔

نسیم اور قدرت اللہ دو ماؤں سے ایک باپ کے بیٹے تھے۔ قدرت اللہ بڑا تھا اور نسیم چھوٹا۔ ان کا باپ ایک متمول آدمی تھا۔ شہر میں بھی جائداد تھی اور ایک گاؤں میں بھی اراضیات تھیں۔ لیکن مرتے وقت اس نے جو وصیت کی اس سے نسیم کی بہت حق تلفی ہوئی۔ شہر کی تمام جائداد جو بہت قیمتی تھی۔ قدرت اللہ کو ملی اور گاؤں کی اراضیات نسیم کے حصے میں آئیں۔ نسیم کو قدرت نے بہت سیر چشم اور فیاض بنایا تھا۔ اُسے جو کچھ ملا وہ اسی پر شاکر اور خوش تھا۔ ترکہ تقسیم ہو جانے کے بعد اس نے مستقل طور پر گاؤں میں بود و باش اختیار کر لی۔

دونوں بھائیوں کے تعلقات گو کچھ ایسے اچھے تو نہ تھے تاہم خاندان کی لاج دونوں نے برقرار رکھی۔ قدرت اللہ کے مزاج میں رعونت کچھ زیادہ تھی۔ اُس پر باپ کا ترکہ حق سے زیادہ مل جانے سے مزاج کچھ اور بھی بگڑا۔ تاہم نسیم بڑے بھائی کا ہمیشہ احترام ہی کیا کرتا۔

دونوں صاحب اولاد تھے۔ قدرت اللہ کی بھی ایک ہی بیٹی تھی لیکن وہ ننھی سی عمر میں ہی ماں کی طرف سے یتیم ہو چکی تھی۔ قدرت اللہ کو اپنی زہرہ سے اتنی محبت تھی کہ اُس نے اُس کی خاطر دوسری شادی نہ کی۔ نسیم کو بھی اللہ میاں نے ایک بیٹی ہی عطا کی تھی۔ لیکن قدرت کا یہ عجیب تماشا تھا کہ قدرت اللہ کی بیٹی زہرہ اور نسیم کی بچی منیرہ شکل و صورت میں اس قدر ملتی جلتی تھیں کہ ایک کو چھپاؤ اور دوسری کو نکالو۔ دوسرے چوتھے مہینے جب نسیم کبھی شہر جاتا تو منیرہ کو بھی ساتھ

ساتھ ہی لے جاتا۔ دونوں بچیاں بڑے پیار اور محبت سے رہتیں۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ نسیم بڑے بھائی کے بُلاوے پر چند روز سے اسکے پاس مقیم تھا۔ قدرت اللہ گرمیوں کے دن کسی سرد مقام پر گذارنا چاہتا تھا اور محض رکھ رکھاؤ کی خاطر نسیم کے اہل وعیال کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس مشورے کے لئے اُس نے نسیم کو گاؤں سے بُلوایا تھا۔ ایک روز شام کے وقت دونوں بھائی مکان کے صحن میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ اچانک مکان کی دائیں جانب سے دھوئیں کا ایک غبار سا اُٹھا۔ ساتھ ہی آگ آگ کی آواز آئی جس طرف سے اوپر جانے کی سیڑھیاں تھیں اُدھر ہی سے شعلے بھڑک رہے تھے۔ آگ بجھانے کا انجن آتے آتے آگ شدت سے پھیل چکی تھی۔ قدرت کی چار سال کی بچی زہرہ کہیں اوپر ہی تھی۔ قدرت نیچے کھڑا زور زور سے آوازیں دے رہا تھا۔ اور نسیم آگ بجھانے والوں کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ مکان کا جو حصہ جل رہا تھا اُس کی ایک کھڑکی میں سے زہرہ نے سر نکال کر دیکھا۔ آگ بجھانے والوں نے جلدی سے سیڑھیاں اُسی طرف لگا دیں۔ قدرت جسے اپنی پیاری بچی کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے خود اوپر چڑھ گیا۔ اور جلتی ہوئی آگ میں زہرہ زہرہ پکارتا گھس گیا لیکن زہرہ کا کہیں پتا نشان نہ ملا۔ اس اثنا میں آگ بجھانے والے بھی اوپر پہنچ چکے تھے وہ زہرہ کی لاش بھی نکال لائے معلوم ہوتا تھا کہ بچی دم گھٹ جانے سے مری ہے۔ قدرت کے اب حواس ٹھکانے نہ تھے۔ جب وہ سیڑھی سے نیچے اُترنے لگا تو

اُسے چکر سا آگیا اور وہ نیچے آپڑا۔ کئی ایک چوٹوں کے علاوہ کمر کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ تین چار مہینے بیماری کی صعوبت اُٹھانے کے بعد وہ بھی زہرہ کو یاد کرتا ہوا عدم کو سدھارا۔ موت سے پانچ سات روز پہلے اُس نے وصیت کی اور تمام جائداد بھائی کو سونپ دی۔ اور یہ خواہش ظاہر کی کہ نسیم گاؤں کی رہائش چھوڑ کر آبائی مکان میں آبسے!

اب ایک مدت سے نسیم گاؤں چھوڑ کر شہر میں آبسا تھا۔ گاؤں میں تو اراضیات کی نگرانی میں وقت کٹ جاتا۔ یہاں بھی آکر وہ بیکار نہ رہا۔ اور کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا۔ مکان کا جو حصہ جل گیا تھا وہ قدرت اللہ نے اپنی حیات میں ہی از سرِ نو تعمیر کروا دیا تھا لیکن نسیم نے اُس نو تعمیر شدہ حصہ کو مقفل کر رکھا تھا۔ اُس کی بود و باش دوسرے حصے میں تھی۔ رضیہ نے کئی بار کہا بھی کہ باقی ماندہ مکان کو بھی استعمال کیا جائے لیکن نسیم رضامند نہ ہوتا۔ رضیہ کو تو شاید معلوم نہ تھا لیکن نوکروں میں اس بند شدہ حصے کے متعلق کچھ کانا پھوسی کئی ایک روز سے ہو رہی تھی۔ اُن لوگوں کا خیال تھا کہ اُنھوں نے اس کمرے کی کھڑکی جہاں زہرہ کی لاش ملی تھی کئی بار کھلتے اور بند ہوتے دیکھی ہے۔ ان میں سے ایک دو تو یہاں تک قسمیہ کہنے کو تیار تھے کہ انہوں نے زہرہ کو بھی کئی بار اس کمرے کی کھڑکیوں سے جھانکتے دیکھا ہے۔ اس میں تو کچھ شک نہ تھا کہ زہرہ اور نسیم کی بچی منیرہ شکل و صورت میں اتنی ملتی جلتی تھیں کہ دیکھنے والے اُنھیں توام بہنیں ہی سمجھتے۔ لیکن مکان کے اُس حصے کی چابیاں تو

نسیم کے پاس ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ شاید منیرہ کبھی کھیلتے کھیلتے ادھر آنکلتی ہو کچھ قرینِ قیاس نہ تھا۔

گھر میں اگر کوئی خلافِ معمول بات ہو تو وہ کچھ زیادہ عرصہ چھپی نہیں رہتی سیڑھیاں چڑھتے ہی بائیں جانب کو جو کمرے تھے ان میں رضیہ اور نسیم رہتے تھے اور ان کے کمروں کی سیڑھیاں بند شدہ مکان کے کمروں کے بالمقابل تھیں۔

ایک روز رضیہ اُس کمرے میں جو اُس نے ملنے جلنے والوں کے لئے سجا رکھا تھا اور ڈرائنگ روم کہلاتا تھا۔ کھڑکی کے پاس بیٹھی کچھ سی رہی تھی کہ اچانک اس کی نگاہ سامنے والے حصّے پر پڑی۔ ایک کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ رضیہ ابھی اُدھر دیکھ ہی رہی تھی کہ وہ کھڑکی بند بھی ہوگئی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر بہنی کے کمرے میں گئی لیکن منیرہ مزے سے بیٹھی اپنی گڑیوں سے کھیل رہی تھی ہاں گڑیوں کے ایک جوڑے کی بجائے گڑیوں کی چھوٹی سی پلنگڑی پر دو جوڑے پاس پاس رکھے تھے۔

"منیرہ! رضیہ نے پوچھا۔ "یہ نئی گڑیاں کہاں سے لیں تم نے؟"

"ہماری تو ہیں امّی!" منیرہ نے معصوم نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارے ابا لائے تھے؟" رضیہ نے پوچھا۔

"نہیں تو" منیرہ نے معصومیت سے سر ہلا کر جواب دیا۔

"پھر کون لایا؟" رضیہ نے بچی کو گود میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"سہیلی کی ہیں۔" منیرہ نے جواب دیا۔

"سہیلی کہاں ہے تمہاری۔" رضیہ نے پوچھا۔

اس کے جواب میں منیرہ ہنستی ہوئی ماں کے گلے سے چمٹ گئی۔

رضیہ بولی۔

"چلو! میرے پاس چلکر کھیلو۔ اکیلی مت کھیلا کرو۔"

"امی!" منیرہ بولی۔ "اگر ہم چلے جائیں گے تو ہماری گڑیاں اُداس ہو جائینگی۔"

رضیہ مسکراتی ہوئی واپس آگئی لیکن اس کے دل میں ایک اُلجھن سی تھی کہ یہ کھڑکی کھولی کس نے اور بند کیسے ہوئی؟ اس کے ساتھ ہی اسے یہ خیال آیا کہ شاید منیرہ کے ابا کسی کو کمرہ صاف کرنے کو کہہ گئے ہوں گے۔ اور اُسے کمرہ صاف کرنے کے بعد کھڑکی بند کرنے کا خیال نہ رہا ہو۔ چنانچہ اُس نے خادمہ کو بُلوا کر پوچھا۔

"یہ ساتھ والے کمرے آج کس نے صاف کئے؟"

"وہ تو بند پڑے ہیں بی بی!" خادمہ نے جواب دیا۔

"کے روز ہوئے وہاں جھاڑو واڑو دئے۔" رضیہ نے پھر پوچھا۔

"کوئی آٹھ ایک روز ہوئے جب میاں نے صاف کروائے تھے۔" خادمہ نے جواب دیا۔

"کس نے صاف کئے تھے۔" رضیہ نے پوچھا۔

"بھنگی نے بی بی!" خادمہ نے جواب دیا۔
"اُسے تاکید کر دو۔" رضیہ بولی۔ "کہ کھڑکیاں دیکھ بھال کر بند کیا کرے۔"
"کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی کیا؟" خادمہ نے پوچھا۔
"ہاں!" رضیہ نے جواب دیا۔
"آپ کو کیسے معلوم ہُوا؟" خادمہ نے پوچھا۔
"میں نے دیکھی تھی۔" رضیہ نے جواب دیا۔
"کب بی بی؟" خادمہ نے پوچھا۔
"ابھی ابھی!" رضیہ نے کہا۔ "تم کیوں پوچھتی ہو؟"
"ایسے ہی بی بی!" خادمہ نے جواب دیا۔
رضیہ کام میں لگ گئی اور خادمہ چلی گئی

خادمہ نے اپنی بی بی سے جو کچھ سنا تھا باہر مردانے میں دوسرے نوکروں سے بھی جا کہا۔
ایک بولا۔
"ہم تو کئی روز سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔"
"کیا؟" خادمہ نے پوچھا۔
"یہی!" اُس نے جواب دیا۔ "کھڑکی کھلنے اور خود بخود بند ہونے کا۔"
"اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے؟" خادمہ بولی۔ کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی

ہوگی۔ ہوا سے خود بخود بند ہو جاتی ہوگی۔"

"واہ بی عاقلہ!" اُس نے ہنسکر کہا۔ "بس اِتنی سی عقل پر ہی ہم سے بات بات پر بگڑا کرتی ہو۔"

"کچھ غلط کہا میں نے!" خادمہ نے ذرا اکڑ کر پوچھا۔

"اجی تم!" نوکر ہنسکر بولا۔ "اور غلط کہو۔"

"تو پھر یہ اونگی بونگی کیا بک رہے ہو۔" خادمہ نے ماتھے پر بل ڈالکر کہا۔

"سبحان اللہ!" پاس سے دوسرا بولا۔ "کیسی میٹھی زبان ہے تیری۔"

"تم چپ رہو جی۔" خادمہ نے کہا۔ "میں اس سے پوچھتی ہوں جو بھاڑ بھی جھونکتا ہے اور لقمان بھی بنتا ہے۔"

"اے بی!" نوکر بولا۔ "تم بگڑتی کیوں ہو۔ ہوا سے کواڑ کھل بھی سکتے ہیں اور بند بھی ہو سکتے ہیں لیکن ہوا کنڈیاں تو نہیں کھول سکتی چٹخنی تو نہیں اُتار سکتی۔"

"یہ تو ٹھیک بات کہی تم نے۔" خادمہ نے کہا۔

اور وہ ہنسکر بولا

"ٹھیک بات کہدینگے تو رات نیند بھی نہ آئے گی تمہیں۔"

"کیا ہے بھیا!" اب خادمہ نے ذرا لجاجت سے کہا۔ "ہم سے نہ کہوگے"

"کہدینگے کسی وقت۔" اُس نے کہا۔ "جب پارہ اُتریگا تمہارا۔"

"ادئی میرے اللہ!" خادمہ نے ذرا ہنسکر کہا۔ "میرے تو ابھی سے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

"ابھی سے کیوں؟" اُس نے ہنسکر کہا۔ "ذرا صبر کرو۔"

"تو اس گھر میں بھوت رہتے ہیں کیا؟" خادمہ نے پوچھا۔

اسوقت اچانک پھر اسی کمرے کی ایک کھڑکی کھلنے کی آواز آئی۔ تینوں نے یکبارگی اوپر کی طرف دیکھا۔ ایک پیاری سی بچی کھڑکی میں سے اِدھر اُدھر جھانک رہی تھی۔

"دیکھا!" پہلے نے ذرا سر ہلا کر کہا۔ "اب کہو۔"

"کیا؟" خادمہ نے پوچھا۔

"اندھی کب سے ہوئیں؟" اُس نے کہا۔

"منیرہ بی بی ہی تو ہے۔" خادمہ نے جواب دیا۔

"منیرہ بی بی یا زہرہ بانو؟" اُس نے پوچھا۔

ان کے دیکھتے دیکھتے کھڑکی پھر بند ہوگئی۔

"کون تھی؟" نوکر نے پوچھا

"منیرہ ہی تھی میرے خیال میں تو۔" خادمہ نے جواب دیا

"اس کمرے میں آئی کیسے؟" نوکر نے کہا۔ "چابیاں تو میاں کے پاس ہوتی ہیں۔"

یہ سُن کر خادمہ نے ذرا خوفزدہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا پھر ہولے ہولے قدم اُٹھاتی وہاں سے چلدی۔

رضیہ ابھی تک سلائی کر رہی تھی۔ خادمہ چپکے سے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"کیا ہے؟" رضیہ نے پوچھا

"منیرہ بانو کہاں ہیں؟" خادمہ نے پوچھا۔

"قینچی لینے گئی ہے۔" رضیہ نے جواب دیا۔

"آپ کے پاس ہی کھیل رہی تھیں"۔ خادمہ نے پوچھا۔

"ہاں!" رضیہ نے جواب دیا۔

"کب سے؟" خادمہ نے پوچھا۔

اب رضیہ نے خادمہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ہے کیا؟"

"بی بی" خادمہ بولی۔ "کھڑکی پھر کھلی تھی۔ منیرہ بانو کھڑکی میں کھڑی ادھر اُدھر جھانک رہی تھیں۔"

"منیرہ جھانک رہی تھی؟" رضیہ نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں بی بی!" خادمہ بولی۔ "میں نے خود دیکھا۔"

"لیکن وہ تو ابھی ابھی یہاں بیٹھی گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔" رضیہ نے جواب دیا۔

"ایک میں نے ہی تو نہیں دیکھا۔" خادمہ بولی۔ "باورچی بھی تھا۔ اور خادم بھی۔"

اتنے میں منیرہ بھی قینچی لئے آ گئی

"قینچی لے آئیں منیرہ!" رضیہ نے پوچھا۔

"یہ لو امی!" منیرہ نے قینچی ماں کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔" اب تم ہمیں ایک جمپر سی دو۔سی دو گی امی؟"

"ہاں!" رضیہ نے کہا

خادمہ چپکے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی رضیہ نے بچی کو گود میں لیکر سینے سے لگا لیا۔ اور دل ہی دل میں اس کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

دو چار روز اسی طرح گذر گئے لیکن رضیہ کے دل میں کچھ کریدسی لگی رہی اس نے کئی بار منیرہ کے باپ سے بھی اسکے متعلق کچھ کہنا چاہا لیکن چونکہ وہ اس قسم کے توہمات کو پسند نہ کرتا تھا، کچھ کہہ نہ سکی۔ منیرہ جس کمرے میں کھیلا کرتی تھی۔ وہاں اکی گڑیوں کے گھروندوں کے علاوہ ایک ہنگوڑا بھی تھا۔ اس میں مخملی گدیاں لگا رکھی تھیں۔ یہ ہنگوڑا یا کھٹولا چھت سے لٹکا رکھا تھا جب کھانا کھانے کے بعد منیرہ سو جاتی تو رضیہ دو ایک بار بچی کو جاکر دیکھ آیا کرتی۔ ایک روز جو رضیہ بچی کو دیکھنے گئی تو ہنگوڑا ہل رہا تھا۔ گویا کوئی ابھی ابھی اوپر سے اُتر گیا ہے۔ رضیہ نے سمجھا شاید منیرہ ہی بیٹھی جھول رہی ہوگی اس کے آنے کی آہٹ پاکر ایسے ہی جھوٹ موٹ سو گئی ہے۔ رضیہ پلنگ پر بیٹھکر بچی کے گدگدیاں کرنے لگی لیکن منیرہ کو خبر تک نہ ہوئی۔ رضیہ کچھ دیر بچی کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر واپس چلی آئی لیکن آج وہ پہلے سے بھی زیادہ متفکر تھی۔ یہ ہنگوڑا کیوں ہل رہا تھا۔ کون بیٹھا جھول رہا تھا۔

کھڑکی کھلی تھی۔"

"اور پھر بند بھی ہوگئی۔" نسیم نے ہنسکر کہا۔

"خادمہ کے علاوہ دوسرے نوکروں نے بھی دیکھا تھا۔" رضیہ نے کہا۔

"ممکن ہے!" نسیم بولا۔ "کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی ہو۔"

"میں نے بھی دیکھا تھا۔" رضیہ نے پھر کہا۔

"کہہ تو رہا ہوں۔" نسیم بولا۔ "کوئی کھلی رہ گئی ہوگی۔ تم تو مفت میں وہم کرتی ہو۔"

"وہم کیسے؟" رضیہ نے کہا۔ "جو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اسے وہم کیسے کہوں۔ خادمہ تو کچھ اور بھی کہہ رہی تھی۔"

"کوئی بھوت دیکھا تھا اس نے۔" نسیم نے ہنسکر پوچھا۔

"بھوت!" رضیہ نے جواب دیا۔ "ممکن ہے بھوت ہی ہو۔"

"پگلی ہوئی ہو تم تو۔" نسیم نے کہا۔ "چلو ذرا ریڈیو سنیں۔"

رضیہ نے آج خادمہ کو خوب ڈانٹ بتلائی اور کھلے الفاظ میں کہدیا کہ اگر اس کی بچی کو پھر کبھی اکیلے چھوڑ کر گئی تو اسے نوکری سے جواب ملجائیگا۔

سب سے عجیب بات یہ تھی کہ منیرہ کو اپنے کمرے میں اکیلے کھیلنا بہت پسند تھا۔ اسے جب موقع ملتا، ماں کے پاس سے کھسک کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ ادھر رضیہ بھی بیٹھے بیٹھے کئی ایک بار اسے جا کر دیکھ آتی۔ اسے وہم کہہ لیجئے یا کچھ یقین تھا کہ اس کی منیرہ کمرے میں اکیلی نہیں ہوتی۔ آسیب یا بھوت کے

کے خیال سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

ایک روز دوپہر کیوقت جب رضیہ صوفے پر لیٹی کوئی کتاب دیکھ رہی تھی تو اُسے منیرہ کے کمرے کی جانب سے زور زور سے ہنسنے کی آواز سُنائی دی۔ وہ جلدی سے اُٹھی اور دبے پاؤں بیٹی کے کمرے کی طرف گئی۔ اور پردے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر جھانکنے لگی۔ اچانک اُس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ خوفزدہ ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ چیخ کی آواز سُن کر خادمہ اور ماما بھاگتی ہوئی آئیں۔ رضیہ خوف سے آنکھیں بند کئے دروازے کے پاس بیٹھی کانپ رہی تھی۔ اور منیرہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھے پاس کھڑی کہہ رہی تھی۔

"امّی! کیا ہوا؟"

"کیا ہوا بی بی!" ماما نے پاس بیٹھکر پوچھا۔

اب رضیہ نے آنکھیں کھولیں۔ اور منیرہ کو گود میں لیکر سینے سے لگا لیا۔

"امّی کیا ہے؟" منیرہ نے پھر پوچھا۔

"تمہارے پاس کون تھا؟" رضیہ نے پوچھا

"ہماری سہیلی تھی" منیرہ نے بھولے پن سے کہا۔

"سہیلی؟" ماما اور خادمہ کے مُنہ سے نکلا "کون؟"

لیکن رضیہ منیرہ کو گود میں لئے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور منیرہ کے کمرے میں اُسی وقت قفل لگوا دیا۔

ماما نے پھر پوچھا۔

"بی بی! کیا بات ہوئی"

"آگ لگے اس گھر کو۔" رضیہ بولی "میں اب یہاں کبھی نہ رہوں گی۔"

"کہاں جاؤ گی امّی!" منیرہ نے پوچھا۔

"گاؤں چلیں گے۔" رضیہ نے کہا۔ "تم بھی چلو گی نا!"

"ابّا بھی جائیں گے؟" منیرہ نے پوچھا۔

"اُن کی مرضی ہے۔" رضیہ نے کہا۔ "ہم تو چلیں گے۔"

"ابّا یہاں رہیں گے تو ہم بھی اُن کے پاس رہیں گے۔" منیرہ نے ماں کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا

"میرے ساتھ نہیں چلو گی؟" رضیہ نے پوچھا۔

"تم بھی مت جاؤ امّی!" منیرہ نے کہا۔

"گاؤں میں تمہاری سہیلیاں بھی تو ہیں۔" رضیہ نے کہا۔ "بھول گئیں انھیں۔"

"یہاں بھی تو ہماری سہیلی ہے۔" منیرہ نے جواب دیا۔

"کون؟" رضیہ نے پوچھا۔

"کون ہے بی بی؟" ماما نے بھی پوچھا۔

"ہماری سہیلی ہے۔" منیرہ نے ذرا ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

ماما اور خادمہ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگیں۔

"تمہارے ساتھ کھیلا کرتی ہے۔" رضیہ نے پوچھا۔

"ہر روز!" منیرہ نے جواب دیا۔

"کہاں رہتی ہے وہ؟" رضیہ نے پوچھا۔

"یہیں!" منیرہ نے جواب دیا۔

"اس گھر میں!" رضیہ نے پوچھا۔

"ہاں!" منیرہ نے جواب دیا۔ "جب ہم اکیلے ہوتے ہیں تو وہ ہمارے پاس آجاتی ہے۔"

اتنے میں نسیم بھی کہیں سے آگیا۔ نوکرانیاں اُٹھ کر چلی گئیں۔ اور منیرہ بھی چپکے سے کھسک گئی

نسیم نے بیوی کو کچھ پریشان سا دیکھ کر پوچھا۔

"خیر تو ہے؟ کچھ پریشان سی نظر آرہی ہو۔"

"میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔" رضیہ بولی۔ "بس آج ہی ہمارے چلنے کا انتظام کر دیجئے۔"

"یا وحشت!" نسیم نے مسکرا کر کہا۔ "آخر کوئی وجہ بھی اتنی بیزاری کی۔"

"آگ لگے اس گھر کو!" رضیہ نے کہا۔ "میری بچی کو تو آج خدا نے بچا لیا۔"

"بچی کو خدا نے بچا لیا؟" نسیم نے تعجب سے کہا۔ "کیا ہوا؟ کہو گی بھی کچھ۔"

بیوی بولی۔

"آپ کو کسی کی بات کا اعتبار ہو تو کوئی کچھ کہے بھی۔ آپ تو ہر بات مذاق میں اُڑا دیتے ہیں۔"

"اجی جناب!" نسیم بیوی کی ٹھوڑی ہلا کر بولا۔ "تم دن کو رات کہو تو ہم اُسپر بھی آمنا صدقنا کہنے کو تیار ہیں۔"

رضیہ بولی۔

میں کئی روز سے یہاں عجیب عجیب باتیں دیکھ رہی ہوں۔ اور صرف میں ہی نہیں، بلکہ یہ آپ کے نوکر چاکر بھی میری بات کا اعتبار نہ ہو تو اُن ہی سے پوچھ لیجئے۔"

"کیا کہہ رہی ہو رضیہ!" نسیم نے کہا۔ "گویا ان کی بات تم سے زیادہ قابل اعتبار ہے۔ واہ صاحب! اچھی قدر کی تم نے ہماری محبت کی۔"

رضیہ بولی۔

"محبت جائے بھاڑ میں لیکن میں اس گھر میں اب ہرگز نہیں رہونگی۔"

"کچھ کہو بھی۔" نسیم بولا۔ "آخر بات کیا ہے؟"

رضیہ نے جو کچھ دیکھا اور سُنا تھا کہدیا۔

"لیکن لڑکی تم نے دیکھی بھی؟" نسیم نے پوچھا

"میری طرف پیٹھ تھی اس کی۔" رضیہ نے جواب دیا۔ "لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ وہ میری منیرہ کے پاس بیٹھی کھیل رہی تھی۔"

"کوئی بات بھی سُنی؟" نسیم نے پوچھا۔

"نہیں!" رضیہ نے جواب دیا۔

نسیم یہ سُنکر خاموش ہوگیا۔ رضیہ نے کہا۔

"بہرکیف! کچھ بھی سہی۔ اب تو میں گاؤں جاؤں گی۔ آج آئے بھی تو سال ہونے کو ہے۔ کوئی کب تک بیٹھا رہے یہاں"۔

"ہاں!" نسیم بولا۔ "اس اتوار کو پورا برس ہو جائیگا۔ اتوار کے روز ہی آگ لگی تھی۔

"شام کا وقت تھا یکبارگی آگ آگ کا شور بلند ہوا۔ آگ بجھانیوالا انجن آتے آتے شعلے آسمان کی خبر لانے لگے۔ پھر سامنے والی کھڑکی میں زہرہ کھڑی نظر آئی۔ بھائی بھاگتے ہوئے اوپر چڑھ گئے۔ لیکن زہرہ کہیں نہ ملی۔ آگ بجھانے والے کھانے والے کمرے سے اس کی لاش نکال لائے۔ میز کے نیچے مری پڑی تھی"

رضیہ جو تعجب سے خاوند کی طرف خاموش بیٹھی دیکھ رہی تھی بولی۔

"آپ سوتے میں بھی اکثر اسی قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں"۔

"سچ!" نسیم نے تعجب سے پوچھا۔ "لیکن تم نے کبھی مجھ سے کہا تو نہیں"۔

"کہنے کو تو کئی بار ارادہ کیا۔ لیکن ....." رضیہ نے اتنا کہہ کر سر جھکا لیا۔

"ہاں!" نسیم نے کہا۔ "اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی واقعے کا دیر تک دماغ پر اثر رہتا ہے۔ خیر! اب تم چلنے کا انتظام کرو۔ آج جمعہ ہے....."

اُس وقت اچانک سامنے والی کھڑکی پھر کھلی۔ دونوں تعجب سے دیکھنے لگے۔ اُن کے دیکھتے دیکھتے ایک لڑکی نے سر باہر نکال کر ادھر ادھر جھانکا۔

"پھر کب واپس آنیکا ارادہ ہے بی بی؟" خادمہ نے پوچھا۔

"میں تو اب نہ آؤں گی۔" رضیہ نے جواب دیا۔ "اور جو آئی بھی تو اس گھر میں تو ہرگز نہ رہوں گی۔"

اچانک نیچے سے کسی نے پکار کر کہا۔

"ارے بھاگو! آگ لگ گئی۔"

رضیہ پلنگ سے اُچھل کر کھڑکی کی طرف گئی۔ مکان کے پچھلے حصّے سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔

رضیہ جلدی سے نیچے آگئی۔ اور نوکر گھر میں چلی گئی

اُسے خیال تھا کہ خادمہ منیرہ کو بھی ساتھ لے آئی ہوگی۔ لیکن یہاں تو نہ منیرہ ہی تھی اور نہ کہیں خادمہ۔ ہوا تیز تھی اور شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے رضیہ پکار پکار کر نوکروں سے منیرہ کو تلاش کرنے کو کہہ رہی تھی اور خود بھی آوازیں دے رہی تھی۔

اتنے میں نسیم بھی آگیا اور یہ سُنکر کہ بچی کا کہیں پتا نہیں۔ حواس باختہ جلتے ہوئے مکان پر چڑھ گیا۔ اس اثنا میں آگ بجھانیوالا انجن بھی آپہنچا۔ اور یہ لوگ نالیاں بچھا کر آگ بجھانے لگے۔ اچانک منیرہ کے کمرے کی کھڑکی کھلی اور دو لڑکیاں پاس پاس کھڑی نظر آئیں۔ دیکھنے والوں میں سے کسی کے منہ سے منیرہ نکلا اور کسی کے زہرہ!

کچھ دیر بعد نسیم منیرہ کی لاش اُٹھائے کھڑکی میں آیا۔ آگ بجھانے والے

سیڑھیاں لگاکر فوراً اوپر پہنچ گئے۔ اور دونوں کو نیچے اتار لائے۔ نسیم کے کپڑوں میں آگ لگ رہی تھی۔ سر کے بال جل گئے تھے۔ آگ بجھانے والوں نے ہاتھوں سے ل [illegible] ر اس کے کپڑوں کی آگ بجھادی۔ نسیم کو خود کئی جگہوں سے جل گیا تھا۔ تاہم وہ بچی کو گود میں اُٹھائے نوکر گھر میں آیا اور منیرہ کو جواب موت کی آغوش میں تھی۔ بیوی کی گود میں ڈال دیا۔

آگ بجھانے والوں نے گھر کی آگ تو بجھادی لیکن رضیہ اور نسیم کے دل میں جو آگ لگی تھی وہ تو حشر تک بھی بجھنے والی نہ تھی۔